جلد ۱۰۴ نومبر ۱۹۸۵ء عدد ۳

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مؤسس

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمہ اللہ تعالیٰ

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۱۰۴ | نومبر ۱۹۸۵ء مطابق ربیع الاول ۱۴۰۵ھ | عدد ۳

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور

زرِ سالانہ تیس روپے - فی پرچہ -/۳ روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ایچ فاروق ایسوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

تبدیلی کے ہر مرحلے میں جو پاکستانی معاشرے کے دستوری اور سیاسی حالات میں پیش آتا ہے، مغرب پرست سیکولرسٹوں کی طرف سے اسلامی رجحانات کے خلاف پورا زور اس بات کے لیے صرف کر دیا جاتا ہے کہ وہ جس حد تک اثر انداز ہوتے اُس سے پسپا ہو جائیں، ورنہ کم سے کم ان کا کوئی قدم آگے نہ بڑھنے پائے۔

یہ قوتیں جو مسلم لیگ کے پرچم "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ" کے نیچے جمع ہو گئی تھیں، وہ تقسیم کے بعد راتوں رات اس بات کو فراموش کر بیٹھیں کہ پوری تحریک کے قائد نے کیا وعدے قوم سے کیے ہیں اور ہندو اکثریت اور انگریزی سامراج کے سامنے پاکستان میں اسلامی تہذیب اور قرآنی قانون کو فروغ دینے کے اعلانات بار بار کر کے مستقبل کی کیا تصویر پیش کی تھی۔ اور اس سلسلے میں کیا دلائل دیئے گئے۔ یہی چیز تھی جس کی وجہ سے پاکستان تمام عالم اسلامی کی توجہات کا مرکز بن گیا کہ یہاں وہ انقلاب رونما ہونے والا ہے جس کے لیے ملّت کا اجتماعی ذہن نسلوں سے خواب دیکھتا آرہا تھا۔

اُسلام کے خلاف جاگیرداری، کمیونزم، بیوروکریسی اور تسلط یافتہ دانشوروں نے لادینیت پسندی کا ایک محاذ قائم کر لیا۔ اِس خفیہ محاذ نے اپنے آپ کو پاکستان میں دستور سازی کے اوّلین مرحلے پر پوری طرح نمایاں کر دیا اور اس محاذ کا جو جرنل اور جو سپاہی جہاں جہاں مورچہ بند تھا، وہیں سے اس نے معرکہ آرائی شروع کر دی۔ دستور ساز اسمبلی، دفتری نظام، سیاسی قیادت، اخبارات، ادب اور ادارہ ہائے تعلیم، ریڈیو، خطابت کا پلیٹ فارم، غرضیکہ کوئی ایسا گوشہ نہ تھا جہاں سے

یہ سیلاب اُمڈ نہ پڑا ہو۔

اس سیلاب کی لہروں کے مقابلے میں چھوٹی سی ایک جماعت —— جماعتِ اسلامی —— نے جو اِس سیلاب مطالبۂ دستورِ اسلامی کا اُٹھا یا اور قلیل مدت میں، قلیل ذرائع کے ساتھ، اور حکومت کی زیادتیوں اور قومی پروپیگنڈہ مشینری کی مخالفتوں کے باوجود لادینیت کے سیلاب کا زور توڑ دیا۔ یہاں تک کہ مارچ ۱۹۴۹ء میں دستور ساز اسمبلی کو وہ قرار دادِ مقاصد پاس کرنی پڑی جس کا اصل مفاد یہی تھا کہ دستوری لحاظ سے لادینیت کو ایک اُصول کے طور پر پاکستان میں جڑیں چھوڑنے کا موقع نہ ملے۔ خدا کی حاکمیت اور کتاب وسنّت کا برتر ماخذِ قانون اور معیارِ فیصلہ ہونا، یہ دو بڑی بنیادیں دستور کی قائم ہوگئیں اور اب تک قائم ہیں۔

پھر قرار دادِ مقاصد پاس ہونے کے بعد، لادینیت پسندوں نے یہ کوشش شروع کی کہ اس دستوری اعلان کو برگ و بار نہ لانے دیا جائے۔ اسی کے لیے سرکاری حلقوں سے دوبارہ ایسے دستوری خاکے لائے گئے جو قرار دادِ مقاصد کے "مقصد" کو کالعدم کرنے والے تھے۔ اس سلسلے میں ہمارے گورنر جنرل غلام محمد صاحب نے دستور کو توڑنے اور تمام دروبست اپنے ہاتھ میں لینے کا اقدام بھی کیا۔ لیکن قومی مطالبے کا دباؤ پھر بھی کم نہ ہوا۔ اور آخر میں دستور کے بنیادی اُصولوں کی کمیٹی کو علماء کی متفقہ ترامیم کے مطابق وہ خاکہ لانا پڑا جس پر دستور ۱۹۵۶ء مبنی تھا۔

دستور ۵۶ء سے جان چھڑانے کے لیے پہلی بار فوجی "بُوٹ" ایوانِ حکومت میں داخل ہوئے۔ اُس وقت سے لے کر اب تک لادینیت پسند طبقوں کی مدد سے ہر حکومت نے اسلامیت سے بھاگنے کی کوشش کی اور ہر بار عوام نے اُن کا تعاقب کر کے اُن سے نفاذِ اسلام کا دستوری یا قانونی وعدہ حاصل کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پوری طرح گھِر جانے کے بعد اُوپر والوں نے تاخیر و التوا کی پالیسی وضع کی جس کے خطوط یہ رہے کہ ایک کمیشن قائم کیا جائے گا جو اِتنی مدت میں مشورے دے گا اور پھر حکومت جن مشوروں کو قابلِ عمل پائے گی اُن کو اختیار کر لے گی۔ یعنی وعدہ اور پھر وعدہ، اعلان اور پھر اعلان۔ عملاً ماحصل کچھ بھی نہیں۔

اس حکمتِ عملی کے ساختہ حکمرانوں نے مسلسل یہ رویہ اختیار کر لیا کہ وہ اسلام کے نعرے لگاتے رہیں، اس کے نفاذ کے وعدے کرتے رہیں اور عملاً سیکولرازم کی راہ پر قدم بڑھاتے رہیں - بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر اکابر نے یہ رویہ اختیار کر لیا کہ وہ نفاذِ اسلام کے سلسلے میں سامنے آنے والے مطالبوں کے متعلق یونٹ ِ ضرورت " باقاعدہ اور صریحی طور پر مطالبہ کرنے والے لیڈروں سے قول و قرار اور یقین دہانیاں کر لیتے ہیں اور پھر کبھی چند مہینوں یا ہفتوں کے بعد اور کبھی چوبیس یا اڑتالیس گھنٹے بعد اپنے قول و قرار کے سکوں کو خود ہی کھوٹا کر کے پھینک دیتے ہیں۔ یہ کسنوٹوں والی صورت تو حال ہی میں آٹھویں ترمیم پر ارکانِ اسمبلی میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کے دوران میں بھی واقع ہوتی - یعنی گھڑی گھڑی کے الگ گھڑیال۔

صدر اور وزیراعظم دونوں اکابر نے یہ یقین دہانی کرائی کہ وہ متعلقہ دستوری دفعات میں ہمارے مطالبے کے مطابق مناسب تبدیلی کر کے نفاذِ شریعت اور شریعت کی بالادستی کی راہ ہموار کر دیں گے مگر بیچ میں غالباً بیوروکریسی نے اڑنگا لگا دیا - اور قول و قرار تبدیل ہو گئے - اب ایک نئی صورت نکالی گئی کہ اس مدعا کا ایک عام ریزولیشن پاس کیا گیا کہ پارلیمنٹ اپنے آئندہ اجلاس میں " اسلامائزیشن" کا معاملہ طے کر دے گی - پھر مژدہ جانفزا یہ کہ ایک " کمیشن" قائم ہوگا جو نفاذِ اسلام کے لیے نقشہ بندی کرے گا اور تجاویز اور مشورے دے گا - یعنی برسوں پہلے کے " کمیشن" سے چل کر پھر " کمیشن" پر آ گئے - بیچ میں جو ٹھوس کام بہ سلسلہ قانون سازی نہایت اچھے، معتمد اور تمام مکاتبِ فکر کے نمائندہ ادارے ــــــ اسلامی نظریاتی کونسل ــــــ نے کئی سال کی محنتوں سے مکمل کیا تھا وہ سارا داخلِ دفتر ہو گیا - تختی صاف کر دی گئی اور اب نیا قلم نئے سرے سے اس ملک میں اسلام کی تقدیر رقم کرے گا - اور اس نئی تقدیر کا خاکہ بنانے کے لیے کمیشن قائم ہوگا۔

جناب ضیاء الحق صاحب نے مکمل اختیارات کے ساتھ نفاذِ اسلام کا جو کام کیا اس کے اجزا الگ الگ کر کے جو قیمت لوگ لگاتے رہے ہیں وہ بعض وجوہ کی بنا پر آہستہ آہستہ ختم ہوتی گئی اور آخر میں تو لوگوں کی امیدوں کے خواب اس حد تک پریشان ہوئے کہ مایوس لوگوں نے تو یہاں تک

سوچا کہ "چولہا لنڈورا ہی بھلا" ----- اور اس طرح لادینیت پسندوں کے لیے میدان اور زیادہ ہموار ہو گیا۔ یہاں تک کہ جی-ایم سید، خان ولی خاں اور غوث بخش بزنجو تو رہے اپنی جگہ، اب ائیر مارشل اصغر خان تک دین و سیاست کی علیحدگی پر اپنی تازہ کتاب میں زور دار وعظ کہہ رہے ہیں۔

مارشل لا کے دور میں اسلامائزیشن کا جو تجربہ ہوا، اس کی کمزوریاں حسب ذیل تھیں:

۱----- یہ کام ایسے حالات میں ہوا کہ حکمران طاقت کے ساتھ حکومتی اور عوامی سطح پر کوئی ایسی ٹیم موجود نہ تھی جو ہم آہنگی سے مل کر اس کام کے لیے پورا زور ڈالتی۔ فرد واحد نے اس حال میں کام کیا کہ خود اس کی کابینہ اور اس کا سیکرٹریٹ اور اس کی ماتحت فورس کے اساطین اس کے ساتھ ذہنی ہم آہنگی نہ رکھتے تھے۔ اس لحاظ سے یہ ایک انوکھا تجربہ تھا۔

۲----- اتنے بڑے کام کے لیے جو حقیقت میں ایک انقلابی عمل ہے، کوئی سوچا سمجھا منصوبہ موجود نہ تھا۔ دوسرے لفظوں میں پروگرام میں کوئی ترتیب اور اولیات و ترجیحات کا کوئی نقشہ تیار نہ ہو سکا۔ جب جس چیز کو چاہا، کسی بھی شکل میں، کسی بھی جانب سے نافذ کر دیا گیا۔

۳----- اسلامیت کے عنوان سے اور تدریج کے نام پر اسلام کے چند متفرق اجزا کو میدان میں بغیر فضا کو تیار کیے ڈال دیا گیا۔ اس صورت میں ان اجزا کی اتنی بے وقعتی ہوئی کہ مثلاً شروع میں "عہد نامے" کی جو تحریک زور شور سے چلائی گئی، اس کا اکثریت کے حافظے میں اب کوئی اثر تک باقی نہیں ہے۔ عہد نامے کو جاندار بنانا تھا تو پھر ملازمت کی درخواست کے ساتھ ترقی پا کر کسی عہدہ پہ جانے کی صورتوں میں، پاسپورٹ کے حصول کے لیے اور دیگر ہر بڑے کام کے لوازم میں اس عہد نامے کو شامل کیا جاتا۔

۴----- اوپر سے نیچے تک اسلامائزیشن کی جو مضبوط فضا بنانی چاہیے تھی۔ اس کے لیے اس سے زیادہ کچھ نہ ہو سکا کہ صدر ضیاء الحق صاحب کی تقریریں ریڈیو، ٹیلی وژن سے نشر ہو جائیں۔ ایسے بڑے کام کے لیے میدان میں کوئی منظم جماعت نہ تھی جو انفرادی تلقینات کے ساتھ بڑی کانفرنسیں منعقد کر سکتی۔ نیز جو کام غلط شکل اختیار کریں اور عوام کی بے اطمینانی کا باعث ہوں ان کو پریس اور پلیٹ فارم سے مؤثر طور پر سامنے لا سکتی۔

۵ ـــ اس پورے کام کا تعلق علماء سے بھی بہت گہرا تھا۔ ہر گروہ کے علماء کی متحدہ قوت کو ساتھ لینے کے لیے ضروری تھا کہ اُن کے ساتھ افہام و تفہیم کسی تمہید پر ہوتی۔ اس کے لیے بہترین صورت یہ تھی کہ اوّل ان علماء کے ۲۲ متفقہ اصولوں (سنہ ۱۹۵۱ء) کو پیشِ نظر رکھا جاتا اور ثانیاً اُن کے ساتھ بیٹھ کر مشورہ کے [illegible] متفقہ [illegible] سکیم حاصل کی جاتی۔

بخلاف اس کے صدر [illegible] نے علماء کے ساتھ ایک اور ہی نہج پر معاملہ کیا۔ یعنی دلخوش کن الفاظ اور متواضعانہ اندازِ گفتگو کے باوجود نظریاتی طور پر ان کی قیادت کرنے کی کوشش کی گئی۔

اس ملک میں اسلامی عوامی حلقوں کی دستوری جدوجہد کے دوران میں اسلامی نظام کے متعلق جو تصور مستحکم ہو کر اتفاق و اتحاد کا ذریعہ بن چکا تھا۔ اس تصور کو ملیا میٹ کر دیا گیا اور امیر، شوریٰ جمہوریت، انتخابات، ووٹنگ اور سیاسی پارٹیوں وغیرہ کے متعلق بالکل دوسرا تصور میدان میں ڈال دیا گیا۔ نفاذِ اسلام کرنے والی حکمران قوت نے جب نقطۂ نظر بابت سازی شروع کر دی تو اس کے سحر نے یہ اثر کیا کہ کچھ دینی عناصر صدر ضیاء الحق صاحب کے نئے تصور کے قائل ہو گئے اور اسے اسلام کی صحیح تر تعبیر تسلیم کر کے کتاب و سنت سے اس کے دلائل دینے لگے۔ اس طرح دینی قوت تقسیم ہو گئی۔ یہ بات مارشل لا کی حکومت کے نقطۂ نظر سے بہت مفید تھی۔ ایک تو دینی قوت کا دباؤ کم ہو گیا اور ایک حصّہ سلطانِ وقت کا ہم نوا ہو گیا۔ دوسرے یہ کہ نئے تصور کی ترویج کا فائدہ یہ تھا کہ فردِ واحد کی حکمرانی کو تقویت ملتی تھی۔ دینی عناصر میں بعض ایسے بھی تھے جو فلسفۂ غنیمت کے زیرِ اثر آ گئے۔ یہ فلسفہ ہمارے ہاں ہمیشہ دخل انداز رہا ہے۔ جب کسی حکومت کو ایک گروہ میں سے حامی قوت مل جاتی ہے تو پھر وہ اختلاف کرنے والی قوت کو وزن نہیں دیتی۔ ظاہر ہے کہ ان چیزوں نے دوسری جانب کے دینی حلقوں میں بددلی پیدا کی۔

اس طرح وہ دینی قوت جسے پوری نفاذِ اسلام کی مہم کی علمبرداری کرنی چاہیے تھی اور عوام میں اس مہم کی جڑیں اُتارنی چاہئیں تھیں، وہ افتراق کا شکار ہو گئی۔

۶ ـــ عوام کی مظلومیت اور محرومیوں کا ازالہ کرنے کے لیے جن اُمور کو خاص طور سے مقدم رکھنا چاہیے تھا ان میں کسی ایک کا اشارہ تک سامنے نہیں آیا۔ چند طبقوں اور خاندانوں کا جو نظامِ جبر و استحصال ہمارے ہاں قائم ہے وہ اس کی چکی میں پس رہے ہیں۔ ایسے میں سیرت کانفرنسوں کے انعقاد

اقامتِ صلوٰۃ کے سفارشی حکم اور اجرائے حدود و تعزیرات کی بحثوں سے عوام کے دل کیسے متحرک ہو سکتے ہیں۔ ان کی نگاہوں میں تو تصورِ شریعت ہی بدل ڈالا گیا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ بس حدود و تعزیرات کا نام شریعت یا نظامِ اسلامی ہے۔ عوام کے اس تاثر نے احیائے اسلام کے برسوں میں [illegible] پچھلے [illegible] سے کام کو سخت نقصان پہنچا ہے۔ اور اب یہ سوال درپیش ہے کہ لوگوں کے جذبۂ اسلامی کو از سرِ نو کس طرح متحرک کیا جائے اور اسلامی نظام کا صحیح تصور دوبارہ [illegible] کے ذہنوں میں کیسے راسخ کیا جائے۔

ہمارے نقطۂ نظر سے یہ بہت بڑا نقصان ہے جو اسلام ہی کے نام پر اسلام کو پہنچا ہے۔

۷ — اسلامی احکام جو سامنے آئے وہ نامکمل اور آمیزش یافتہ شکلوں میں سامنے آسکے۔ اُن سے وہ اثر پیدا نہیں ہو سکتا جو خدا اور رسولؐ کو مطلوب ہے۔

۸ — ایک طرف نفاذِ اسلام کے اقدامات اور چرچے ہوتے رہے اور دوسری طرف نظام؟ رشوت، خیانت، قتل، ڈاکے، اغوا، تاراجیِ عصمت، عیاشی، فحاشی، مغربی ثقافت — ہر فتنہ پہلے سے زیادہ تیز رفتاری سے بڑھتا چلا گیا۔

اِس تضاد کو دیکھ کر لوگ پریشان ہوئے، تھوڑا بہت چیخے، چلائے، مگر کوئی تحریک تو چلا نہ سکتے تھے، اس لیے کچھ نہ ہو سکا تو مایوسی کے غار میں چُپ سادھ کر بیٹھ گئے۔ ہمارے وہ بزرگ جو "صفائیت" کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوئے۔ بھی مراقبے میں چلے گئے۔

وہ اسلام کیا جو لوگوں کے دلوں میں نئی اُمنگ اور ابھار پیدا نہ کرے۔

۹ — اسلامائزیشن کا کام کرنے والی قوت کو اتنا مضبوط ضرور ہونا چاہیے کہ ہر ضروری چیز پہلے اپنے اُوپر، اپنے قریبی رفقا اور اپنے ماتحت کام کرنے والی مشینری پر نافذ کرسکے۔

۱۰ — اسلامائزیشن کا عمل کبھی بھی بغیر اس کے کامیاب نہیں ہو سکتا کہ اُوپر سے نیچے تک مختلف شعبوں میں سربراہی اور کارپردازی کے لیے ایسے لوگ مامور کیے جائیں جو اپنے معروف کردار اور کام کے ریکارڈ کے لحاظ سے سچے اسلامی جذبے سے کام کرنے والے ہوں۔ حتیٰ کہ ماتحت عملے میں بھی کم از کم صریحی مخالفانہ ذہنیت رکھنے والے عناصر کی کوئی جگہ نہیں ہونی چاہیے۔ ضابطۂ ملازمت میں اس مقصد کے لیے ایک دفعہ کا شمول کافی تھا۔ مگر مارشل لا اور تو بڑے بڑے

معرکے سر کرتا رہا۔ بس یہ ایک ذرا سی تبدیلی ضابطہ نہ ہو سکی۔

نتیجہ یہ کہ ماتحت عملہ تو کجا، شعبوں کے سربراہوں میں اسلام اور نظریۂ پاکستان کے مخالفین موجود ہیں۔ رہے عام ملازمین تو ان کی اکثریت پچھلے سالوں میں اسلامی اصلاحات کا کھلے بندوں مذاق اڑاتی رہی ہے۔

۱۱۔ اس دور میں مختلف راستوں سے سیکولرسٹوں، کمیونسٹوں اور مخالفِ اسلام ادیبوں، نیز فلم اور ٹیلی وژن کے آرٹسٹوں، موسیقاروں اور ایکٹروں کو اعزازات وانعامات سے نوازا گیا۔ کیا یہ سب کچھ نفاذِ اسلام کا تقاضا تھا۔

(۱۲) سب سے بڑی غلطی یہ کہ مارشل کے ڈنڈے سے اسلام کو آگے لانے کی ایک محدود سی کوشش کی گئی۔ حالانکہ مارشل لا قانونِ شریعت سے بالاتری اور خدا و رسولؐ کے دیئے ہوئے بنیادی حقوق کی نفی کی وجہ سے خود اسلام سے سندِ منظوری حاصل نہیں کر سکتا۔ ڈنڈے کا اسلام تو کوئی اچھا اور گہرا اثر دلوں پر نہیں چھوڑ سکتا۔ پھر مارشل لا کے ڈنڈے سے مزاحم اور منحرف قوتوں کو روکنے کی جہاں جہاں ضرورت تھی، وہاں اس ڈنڈے کا سر مسلسل جھکا دیکھا۔

اِن سارے حقائق کا شعور رکھتے ہوئے ہمارا یہ رویہ رہا کہ کوئی چھوٹی سے چھوٹی اچھی بات بھی سامنے آئے تو اس کو محض اس وجہ سے مسترد نہ کر دیا جائے کہ ہمیں مجموعی نظام اور اسلامی اسکیم سے اختلاف ہے۔ اور ہمارا یہ رویہ پہلے دن سے اسی طرح ہے۔ قراردادِ مقاصد پاس ہوئی تو ہم نے خیر مقدم کیا، حالانکہ ہم جانتے تھے کہ یہ قراردادِ مقاصد بطورِ اعجاز اسلام کا نفاذ نہیں کر دے گی۔ تبدیلی صرف اتنی تھی کہ ہمارے لیے سعی و جہد کا راستہ پہلے سے زیادہ کشادہ ہو گیا۔ ۱۹۵۶ء کا دستور پاس ہوا تو ہم نے اسے اس بنا پر نیک فال سمجھا کہ اسلام کا کام کرنے کے لیے دستور نے جمہوری راستے بنا دیئے ہیں۔ پی پی پی کی حکومت نے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا تو اگرچہ اس سے اسلام کا نفاذ تو نہیں ہو جانا تھا، مگر چونکہ اسلامی نقطۂ نظر سے یہ تبدیلی بے حد اہم تھی لہٰذا ہم نے اس پر خوشی محسوس کی۔ آخر اسی مقصد کے لیے مؤسسِ جماعتِ اسلامی اور اس کے قائد مولانا مودودیؒ پھانسی

کی کوٹھڑی تک پہنچے تھے ۔ اپنی اسی مستقل اصولی پالیسی کے تحت ہم نے ہر اس تقریر، اعلان یا حکم کو ایک اچھا قدم قرار دیا جس میں اسلامیت کی ادنیٰ جھلک بھی تھی ۔

مگر یوں نہیں ہوا کہ ہم سامنے آنے والے صرف متفرق اسلامی اجزا کی قصیدہ خوانی میں لگ گئے ہوں ۔ بلکہ ہر مرحلہ پر تنقیدی انداز سے ساتھ ساتھ واضح کیا کہ ہونا کیا چاہیے اور مزید کن باتوں کی ضرورت ہے ۔

نیز ہم نے نفاذِ اسلام کے جزوی، غیر مربوط، متفرق اور ناقص اقدامات کا محاکمہ کرتے ہوئے نفاذِ اسلام کی پوری صحیح اسکیم کو بھی ایک سے زیادہ بار واضح کیا ۔

اِن چیزوں کا ریکارڈ موجود ہے ۔ ہم نے ہر بار اپنی بات ایسے واشگاف انداز میں کہی کہ ہم کو مارشل لا کی بی ٹیم قرار دینے والے اکابر تنقیدی باتیں ادھوری اور زیرِ لب ہی کہتے رہے اور وہ نفاذِ اسلام کی کوئی واضح اسکیم پیش کرنے سے بالکل قاصر رہے ۔

ہمارے اُصول پسندانہ موقف کو اسی واقعہ سے سمجھا جا سکتا ہے کہ ہمارے جو لوگ ابتدا میں اِس دعوت پر بطور وزیر شریکِ حکومت ہوئے تھے کہ آیئے اور حقیقی اسلامی نظام کو صحیح طور پر نافذ کرنے میں ہماری مدد کیجیے ۔ وہ چند ماہ کے تجربے کے بعد اسی بنیاد پر مستعفی ہو گئے کہ ان کے لیے صحیح اسلوب سے مؤثر کام کرنے کا کوئی موقع نہیں ہے ۔ کمزوری اگر ذرا بھی ہوتی تو یہ لوگ عہدوں سے چمٹے رہتے، جیسے کہ دوسری مثالیں موجود ہیں ۔

ہمارے عمائد کی طرف سے " ترکِ وزارت " کا اقدام بجائے خود اس بات کا اعلان تھا کہ حصولِ نصب العین کے لیے کام کرنے کا راستہ مسدود ہے ۔

ہمارے جو دوست اب قومی ایوان میں پہنچے ہیں، ان کا مقصد عہدے یا مفاد حاصل کرنا نہیں ہے ۔ بلکہ وہ اسلام ہی کی خدمت کے لیے گئے ہیں اور اس کے لیے جمہوری راستے صاف کرانے کی کوشش میں لگے رہے ہیں ۔

آٹھویں ترمیم اور اس کے بعد آنے والی نویں ترمیم کے سلسلے میں آزاد گروپ کے ساتھ جماعت اسلامی گروپ نے تعاون کر کے شدید مزاحمتوں کا مقابلہ کرتے ہوئے ایک طرف قابلِ قدر حد تک جمہوری اصولوں کو منوایا ہے اور دوسری طرف شریعت کی بالادستی اور اس کی تنفیذ کے لیے تازہ دستوری فیصلہ حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ انتہائی مخالفتوں کے پتھروں سے ٹکراتے ہوئے اس چھوٹے سے گروپ نے قدم آگے بڑھایا۔ کم سے کم اتنا ہوا کہ ایک ریزولیشن اسمبلی نے پاس کر دیا جس کے تحت اگلے اجلاس میں چند متعین امور (جنہیں ریزولیوشن میں لایا گیا ہے) دستوری ترمیم کا حصہ بن جائیں گے۔

اچھا تو یہ تھا کہ یہاں تفصیلی تجزیہ کر دیا جاتا کہ کس پہلو سے دستور میں کہاں کہاں کیا مفید تبدیلیاں ہوئی ہیں، مگر اشارات کا پھیلاؤ پہلے ہی زیادہ ہو گیا ہے اور رسالے کے کم صفحات ان کے لیے باقی ہیں۔ تفصیلات اخبارات سے نہیں تو ہمارے اپنے شائع کردہ پمفلٹوں وغیرہ سے مل جائیں گی۔ خصوصاً پروفیسر خورشید صاحب کا انگریزی پمفلٹ آٹھویں ترمیم کے متعلق پڑھنا چاہیے۔

ذاتی طور پر میرا اپنا ذہن یہ ہے اور میرا خیال ہے کہ جماعت کے کم ہی ذی شعور لوگ مجھ سے اختلاف کریں گے کہ دستوری اور پارلیمانی مساعی جزیہ جز صرف راستے کھول سکتی ہیں یا رکاوٹیں دور کر سکتی ہیں۔ جہاں تک عملاً نفاذِ اسلام کے انقلابی کام کا تعلق ہے، تو وہ دعوت کی توسیع اور رائے عام کے ہمہ طرفہ اور مسلسل دباؤ ہی سے ہو سکتا ہے۔ اسی لیے میں پہلے بھی ان اوراق میں یہ واضح کر چکا ہوں کہ انتخابات اور اسمبلیاں بھی ہمارے لیے دعوت اور اثر اندازی کے میدان ہیں اور ان میدانوں کو بھی کبھی خالی نہ چھوڑنا چاہیے۔ لیکن اصل انقلابی عمل تو دعوتی اور تنظیمی اور تحریکی کام ہی کے زور پر آنے سے ہو گا اور اسمبلیوں میں جانے والے دوستوں کے لیے قدم آگے بڑھانا اسی صورت میں ممکن ہو گا کہ باہر سے ان کے ہاتھ مضبوط کیے جائیں۔

ہمارے کارکن یقیناً اتنے باشعور ضرور ہیں کہ وہ اس مغالطے کا شکار نہیں ہوں گے کہ بارہ پندرہ افراد کے قومی ایوان یا کچھ دوسروں کے صوبائی ایوانوں میں چلے جانے سے اسلامی انقلاب

یا قیامِ نظامِ اسلامی کی ساری ذمہ داری ان پر عاید نہیں ہو جاتی، بلکہ یہ اصل ذمہ داری آج بھی کارکنان ہی کی ہے۔ اور انقلاب کی جو بھی لہر اُٹھے گی، دیہات کی گلیوں سے، کسانوں کی جھونپڑیوں اور کھیتوں سے، کارخانوں سے، دفتروں سے، بازاروں سے، درس گاہوں سے، —— اور خاکِ وطن کے ایک ایک ذرے سے اُٹھے گی۔

خدارا اس بھاری اور مسلسل جاری رہنے والی ذمہ داری کو ادا کرنے میں غفلت و تساہل سے کام نہ لیجیے۔ اُٹھیے، تگ و دو کیجیے اور آگے بڑھیے۔

---

(۲)

ربیع الاوّل کا مبارک مہینہ قریب آلگا ہے۔ یہ مہینہ ہماری انتہائی مسرت کا مہینہ اس وجہ سے ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کا دن اس میں آتا ہے اور ہمارے اندر محبتِ رسولؐ کی شمع کی لَو تیز کر دیتا ہے۔

برصغیر میں مذہبی تقاریب یا خاص دنوں کے ساتھ میلے ٹھیلوں کا جو انداز شامل ہو گیا ہے، رسولِ برحق کی یاد اُن سے لپٹا بلند ہے۔ یہ چیزیں بالعموم اُس سرچشمۂ نور تک جانے والی راہوں کی دیوار بن جاتی ہیں۔ اس دیوار کو ہم جذبۂ محبتِ رسولؐ ہی سے توڑ سکتے ہیں۔ جائز طریقوں سے اور غیر متوازن سرگرمیوں اور اسراف سے بچ کر خوشی منانا برحق، مگر اصل خوشی کی راہ یہ ہے کہ ہم محبتِ رسولؐ کے جذبے کی روشنی میں اطاعتِ رسولؐ کا مقام حاصل کر سکیں۔ ہمارے افکار اور ہمارے نظریات، ہماری کمائی اور ہمارے مصارف، ہماری سیاست اور مالیات، ہماری قدریں اور پیمانے، ہمارا تصورِ انسان اور ہمارا اخلاقی شعور، ہمارا ادب اور ہماری ثقافت رسولِ برحقؐ کی لائی ہوئی تعلیمات کے سانچے میں ڈھل جائیں۔

ہمارے اندر اس مبارک موقع پر یہ ارادہ اُبھرنا چاہیے کہ ہم اسی دعوت کو پھیلانے، اسی تحریک کو موجزن کرنے اور اسی نظامِ عدل و احسان کو رائج کرنے کے لیے سعی و جہد کریں جس کے لیے حضورؐ نے اپنی ساری توانائیاں صرف کیں اور ساری عمر قربانیاں دیں۔ نیز اس کام کے لیے ہم شرک کی

ہر صورت کے خلاف اور طاغوت کی ہر سرگرمی کے خلاف جہاد جاری رکھیں ـــــ نیکی کو غالب کرنے اور بدی کو ملیامیٹ کرنے کے لیے متحد و منظم ہو کر تمام تدبیریں اختیار کریں۔

کم سے کم اتنا تو ہو کہ ہر بار ربیع الاوّل کے آنے اور یادِ میلاد تازہ کرنے کے نتیجے میں ہر مرد و زن کم سے کم اپنی زندگی میں سے کوئی ایک ایسی چیز تو خارج کرے جسے حضورؐ نے منع فرمایا اور کوئی ایک ایسی چیز قبول کرے جسے حضورؐ نے لازم ٹھہرایا۔ محبتِ رسالت کا یہ ادنیٰ ترین عملی اظہار ایک ایسی تبدیلی کا پیرایۂ آغاز بن سکتا ہے جو دیر سویر آدمی کو ایمان و اسلام کی منزل تک پہنچا سکتا ہے۔

اگر اس کم سے کم درجے کی اصلاح پذیری اور فلاح یابی کے بھی ہم مستحق نہ بن سکیں تو پھر ہجوموں اور جلوسوں اور نعتوں اور قوالیوں اور جھنڈیوں اور محرابوں سے اسلام کا کیا واسطہ، اور ہمارے کھوکھلے اظہارِ مسرت کی خدا اور رسولؐ کے یہاں کیا قدر!

ربیع الاوّل کا مرکزی پیغام قرآن کے ان مبارک الفاظ میں ہمارے سامنے ہے کہ:

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ -

---

تصحیح

ترجمان القرآن نمبر ص ۱۳ میں النسائی کی شائع شدہ روایت میں غلطیاں رہ گئی ہیں تصحیح کرلیں۔

ـ سطر ۲ میں صحیح عبارت یوں ہے۔ اَلَا اُخْبِرُكُمْ بِخَيْرِ النَّاسِ وَشَرِّ النَّاسِ۔ (یہاں مضمون میں ہے وَاَبْشِرِ النَّاس۔)

ـ سطر ۳ میں صحیح لفظ ہے: بَعِيْرِهٖ (لکھا گیا تھا: بَعَبِرِهٖ)

ـ سطر ۴ میں صحیح لفظ ہے: يَاْتِيَهُ الموت (لکھا گیا تھا: باتيهِ الموتُ)

ـ سطر ۴ ہونا چاہیے تھا: رَجُلاً فَاجِرًا (یہاں فاجراً چھوٹ گیا تھا)

ـ سطر ۵ میں صحیح عبارت: يَرْعَوِى اِلٰى شَيْءٍ مِنْهُ (یہاں یوں لکھا گیا: يرعَوِى بشئٍ منهُ)

حکمتِ سیّد مودودیؒ

ہمارے عوام اور علماء

اقتباس کردہ: جناب الیف الدین ترابی صاحب

(۱)

اس قوم میں مدت ہائے دراز سے یہ کمزوری پرورش پا رہی ہے کہ ایک چیز کو حق جانیں اور دل سے اُسے حق مانیں مگر اس کے لیے کوئی قربانی گوارا نہ کریں، نہ وقت کی، نہ مال کی، نہ خواہشات نفس کی، نہ اپنے مرغوب افکار و نظریات کی، نہ اپنے جاہلیت کے اذواق اور دلچسپیوں کی اور نہ کسی اور چیز کی۔ انہیں وہ حق پرستی تو بہت اپیل کرتی ہے جس میں حق کو زبان سے حق کہنا اور اس پر لفظی عقیدتوں کے پھول نچھاور کرنا اور اس کے لئے چند نمائشی کام کر دینا کافی ہو اور اس کے بعد انہیں اس حق کے خلاف ہر طرح اپنے کاروبار، اپنے ادارے اور اپنی زندگی کے سارے معاملات چلانے کی پوری آزادی حاصل رہے اسی لئے وہ نام نہاد مذہبیت کے ان راستوں کی طرف خوشی خوشی لپک جاتے ہیں جن کی دینداری اور سعی و عمل کا سارا دارومدار حق اور جاہلیت کی مصالحت (Compromise) پر ہے لیکن ایسی حق پرستی ان کے لئے ایک ناقابلِ تحمل بارگراں ہے جو کفر و اسلام، حق و باطل اور اطاعت و بغاوت کے درمیان دوٹوک فیصلہ چاہتی ہو اور جس میں ہر اس شخص سے جو حق کو ماننے کا اقرار کرے۔ پہلا مطالبہ یہ ہو کہ وہ یکسو ہو جائے اور پھر مزید مطالبہ یہ ہو کہ جس چیز کو اس نے حق مانا ہے اس کے لئے اپنی پوری شخصیت کو تج دے اور عمر بھر کے لئے تج دے۔ وقت کی، مال کی، خواہشاتِ نفس کی، مرغوبات اور دلچسپیوں کی، امنگوں اور تمناؤں کی، توقعات اور امیدوں کی، گھر سے گہرے تعلقات کی، قوتوں اور قابلیتوں کی،

غرض ہر قسم کی قربانیاں گوارا کرے اور ایک دو دن کے لئے نہیں، چار چھ مہینے کے لئے نہیں، کسی مقررہ مدت کے لئے نہیں بلکہ جب تک جینا ہے اس وقت تک گوارا کرے۔

آپ اس گئے گزرے زمانہ میں بھی ایسے مسلمان بہت پا سکتے ہیں جو خوشی خوشی جان دینے کے لئے تیار ہو جائیں گے، سینے پر گولیاں کھالیں گے، سروں پر لاٹھیوں کی بارش سہہ لیں گے، جیل کی سختیاں برداشت کرلیں گے۔ یہ سب ان کے لئے چھوٹے اور ہلکے کام ہیں جنہیں بہ آسانی برداشت کر سکتے ہیں لیکن اپنی پوری زندگی کو ایک ضابطہ میں کس دینا، عمر بھر ایک مقصد کے پیچھے صبر سے کام کئے چلے جانا، جیتے جی اپنی خواہشات پر بریک لگائے رکھنا، اپنی عادتوں اور ذہنیتوں کو بدل ڈالنا اور کسی خارجی دباؤ کے بغیر اخلاقی ذمہ داریوں کو قبول کرنا اور نباہنا۔ یہ فی الحقیقت ان کی برداشت سے بہت زیادہ بھاری بوجھ ہے۔

یہ نمائشی ہنگاموں میں ایک عمر گزار سکتے ہیں مگر کسی ایثار طلب عہد کو سال دو سال بھی مشکل نباہ سکتے ہیں۔

ان کی مثال اس جنگلی گھوڑے کی سی ہے جو روزِ پیدائش سے آزاد پھرنے کا عادی رہا ہو کسی گاڑی میں جت کر ایک مقررہ راستے پر سیدھا چلنے کے لئے تیار نہ ہو۔ ایسے گھوڑے کو اگر کسی طرح رام کر کے باندھ دیا جائے تو بہت جلدی وہ بندشوں سے اکتانے لگتا ہے۔ حتیٰ کہ ایک دن رسی تڑا کر ایسا بھاگتا ہے کہ پہلے سے بھی کچھ زیادہ دور نکل جاتا ہے۔

(۲)

ہمارے عوام تو دین کے فہم اور اس کی روح کے ادراک سے محروم ہیں ہی مگر ہمارے درمیان جو لوگ مذہبی میلان رکھنے والے ہیں، وہ اس معاملہ میں کچھ ان سے بھی بڑھے ہوئے ہیں۔ مخلص اور نیک لوگوں تک کا یہ حال ہے کہ وہ دینداری اور فن دینداری اور پیشۂ دینداری کے فرق کو نہیں جانتے دین کی حقیقی قدروں کو انہوں نے دوسری قدروں سے بدل لیا ہے یا خلط ملط کر دیا ہے۔ جو چیزیں دین میں نہایت اہم ہیں بلکہ اساسی اہمیت رکھتی ہیں وہ ان کی نگاہ میں ہماری تمام کوششوں کے باوجود محض ایک ضمنی اہمیت حاصل کر سکی ہیں کیونکہ ایک طویل مدت کی تعلیم و تلقین سے ان کا اندازِ فکر کچھ ایسا ہی

بنا دیا گیا ہے۔ بخلاف اس کے جو چیزیں دین میں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں یا کسی قدر رکھتی بھی ہیں تو محض ایک ضمنی اہمیت، وہی ان کے نزدیک مدارِ دین ہیں کیونکہ فنِ دینداری اور پیشۂ دینداری نے ان کو یہی مرتبہ دیا ہے۔ عالم ہوں یا عامی یا متوسطین بہر حال ان کے درمیان کم ہی ایسے اشخاص پائے جاتے ہیں جو صحیح دینی بصیرت کی بناء پر جانتے ہوں کہ خدا کے دین میں کونسی چیزیں کس درجہ میں مطلوب ہیں۔ کس چیز پہ کتنا زور دینا چاہیئے اور کونسی چیز کس چیز کی خاطر چھوڑی جا سکتی ہے [۱]

---

[۱] روداد حصہ دوئم صفحہ ۱۷ - ۱۹

قرآن کا تصوّرِ امانت

جناب غزل کاشمیری صاحب - استاد شعبہ علوم اسلامیہ (بہاولپور)

امانت کے موضوع پر کچھ سوچنے اور بات کرنے کے لیے قرآن کریم میں سورہ الاحزاب کی آیت ۷۲ پر نظر ڈال لینا ضروری ہے۔

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَۃَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ -

(ہم نے آسمانوں، زمینوں اور پہاڑوں پر امانت پیش کی)

اِس امانت کی تفسیر میں بے شمار اقوال ہیں۔ ایک رائے ہے کہ اس سے مراد عقل ہے۔ بعض نے کہا اس سے مراد توحید ہے۔ بعض نے کہا اس سے مراد تمام وظائفِ دینی ہیں۔ اور بعض نے کہا اس سے مراد اطاعتِ خداوندی ہے۔ ان تمام اقوال میں کوئی تناقض نہیں ہے۔ سب کا خلاصہ یہی نکلتا ہے کہ امانت سے مراد خدا تعالیٰ کی اطاعت اور اس کے فرائض ہیں۔

گویا اللہ اور اس کے رسولؐ کے فرائض پورے نہ کرنا سب سے بڑی خیانت ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے:

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِکُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ (الانفال-۲۷)

"اے ایمان والو! اللہ اور رسولؐ کے ساتھ خیانت نہ کرو اور جانتے بوجھتے ہوئے اپنی امانتوں میں بھی غداری نہ کرو۔"

اللہ تعالیٰ کے فرائض یا تو عقاید کی صورت میں ہیں مثلاً توحید، رسالت، آخرت وغیرہ یا اعمال کی صورت میں مثلاً نماز، روزہ، حج وغیرہ، یا پھر معاملات کی صورت میں جو انسانوں کے مابین طے پاتے ہیں مثلاً تجارت، سیاست اور مدنی مسائل وغیرہ۔ ان تمام میں کوتاہی کرنا خیانت ہے۔

اگر کسی شخص کے پاس کوئی چیز رکھی جائے تو اُسے بعینہٖ لوٹانا امانت داری ہے۔ یہ چیز مادی و حسی اور کثیف صورت میں بھی ہو سکتی ہے، مثلاً روپے، کپڑے، گندم وغیرہ اور غیر مادی و غیر مرئی اور لطیف بھی ہو سکتی ہے مثلاً کسی شخص کو کوئی بھید بتایا جائے تو اُسے اپنے تک ہی محدود رکھنا امانت داری ہے۔ یا کسی کے سامنے کوئی قول و قرار یا وعدہ وغیرہ کیا جائے تو اُسے پورا کرنا امانت داری ہے۔ اور پورا نہ کرنا خیانت ہے۔ اسی کا دوسرا نام بے ایمانی اور بد دیانتی ہے۔

کسی دوست کے بھید یا راز کو عیاں کرنا، یا ملی و قومی راز دشمنوں تک پہنچانا بھی خیانت ہے۔ قرآن پاک میں حضرت نوحؑ اور لوط علیہما السلام کی بیویاں ایک تو اپنے پیغمبر خاوندوں پر ایمان نہیں لائی تھیں، دوسرے وہ اُن کے بھید کافروں پر عیاں کر دیتی تھیں۔ اُن کے بارے میں قرآن پاک میں ارشاد ہے۔

كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتَاهُمَا

"یہ دونوں ہمارے دو نیک بندوں کی بیویاں تھیں لیکن انہوں نے ان دونوں کی خیانت کی۔"

اسی سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اپنے قومی و ملی مصالح کے خلاف قدم اُٹھانا بھی قوم کے ساتھ خیانت ہے۔ فتح مکہ سے قبل ایک صحابی حاطب بن ابی بلتعہ نے اہلِ مکہ کو اطلاع کر دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُن پر چڑھائی کرنے آ رہے ہیں۔ اگرچہ وہ اس طریقہ سے مکہ میں رہائش پذیر اپنے رشتہ داروں کو بچانا چاہتے تھے اور مشرکین پر احسان دھرنا چاہتے تھے لیکن جب یہ خط راستے ہی میں پکڑ لیا گیا تو حضرت عمرؓ نے کہا:

خَانَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالْمُؤْمِنِيْنَ [1]

"اُس نے اللہ، رسولؐ اور مومنوں سے خیانت کی ہے۔"

---

[1] بخاری، کتاب المغازی، باب ۹ - مسند احمد جلد ۲ ص ۳۲۱

اسی طرح اگر کسی شخص کو کوئی عہدہ یا ذمہ داری سونپی جائے تو اُسے بطریقِ احسن پورا کرنا یا اس کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا بھی امانت داری ہے۔ اور اُسے پورا نہ کرنا خیانت ہے۔ ایک بار حضرت ابوذر غفاریؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا آپ مجھے کسی عہدہ پر سرفراز کیوں نہیں کرتے۔ اس پہ آپؐ نے ابوذر کے کندھے پر تنبیہاً ہاتھ مار کر کہا:

یَا اَبَا ذَرٍّ اِنَّکَ ضَعِیْفٌ وَاِنَّھَا اَمَانَۃٌ وَاِنَّھَا یَوْمَ الْقِیَامَۃِ خِزْیٌ وَنَدَامَۃٌ اِلَّا مَنْ اَخَذَھَا بِحَقِّھَا وَاَدَّی الَّذِیْ عَلَیْہِ مِنْھَا[1]

"اے ابوذر! تو کمزور ہے اور عہدہ تو ایک امانت ہے اور قیامت کے دن ندامت اور شرمندگی کا باعث بنے گا۔ الّا یہ کہ جس نے اسے حق دار سمجھ کر لیا اور اس کے حقوق پورے کر دیئے"۔

اگر کسی شخص پر گھریلو معاملات کے سلسلے میں کوئی بھروسہ کیا جائے اور گھر پر اُسے کوئی ذمہ داری سونپی جائے تو اُسے پورا کرنا امانت داری ہے اور اس کے عزت و ناموس کو تار تار کرنا خیانت ہے۔ حضرت یوسفؑ پر جب اتہام لگائے گئے تو آپ نے کچھ عرصہ بعد تحقیقات کرا کے اپنی برأت ثابت کر دی اس پر آپ نے کہا:

ذٰلِکَ لِیَعْلَمَ اَنِّیْ لَمْ اَخُنْہُ بِالْغَیْبِ (یوسف - ۵۲)

"یہ سب کام میں نے اس لیے کیا ہے تاکہ عزیزِ مصر جان لے کہ میں نے اس کی عدم موجودگی میں اس کی خیانت نہیں کی"۔

اس سے ثابت ہوا کہ عورت اور مرد کی شرمگاہیں ایک دوسرے کی امانتیں ہیں، انہیں ناجائز طور پر استعمال کرنا خیانت ہے۔

اگر زبان سے کوئی اقرار کیا جائے اور دل میں اس کے خلاف رکھا جائے تو یہ بھی خیانت ہے قرآنِ پاک میں ارشاد ہے:

اِنْ یُّرِیْدُوْا خِیَانَتَکَ فَقَدْ خَانُوا اللّٰہَ مِنْ قَبْلُ (الانفال - ۷۱)

---

[1] مسلم کتاب الامارہ، حدیث ۱۶۔ مسند احمد، جلد ۵، ص ۱۷۳۔

"اگر وہ آپ کے ساتھ خیانت کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو اس سے پہلے وہ اللہ کے ساتھ خیانت کر چکے ہیں۔"

یہ آیت منافقین کے بارے میں اتری تھی۔ سنہ ۴ھ کا واقعہ ہے کہ بنو اُبیرق کے طعمہ بن بشیر نے ایک انصاری کی زرہ چرائی۔ جب اس کا تجسس شروع ہوا تو اس نے مالِ مسروق ایک یہودی کے ہاں رکھ دیا۔ قریب تھا کہ نبی پاک ظاہری شواہد کی بنا پر یہودی کو مجرم ثابت کر دیتے مگر فوراً یہ وحی اتری:

وَلَا تَكُنْ لِلْخَائِنِينَ خَصِيمًا۔ (النساء - ۱۰۵)

"آپ خیانت کرنے والوں کی طرف سے جھگڑنے والے نہ بنیں"۔

طعمہ منافق تھا، چنانچہ نبی پاکؐ کا فیصلہ سن کر مکہ بھاگ گیا۔ وہاں کافروں کے حلقہ میں شامل ہو گیا۔ گویا منافقت اور خیانت ایک ہی چیز ہے۔ ایک حدیث میں منافق کی تین نشانیاں بیان کی گئیں ہیں۔

آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ، إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ وَإِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ۔ (ریاض الصالحین کتاب الآداب)

"جب بات کرے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو پورا نہ کرے اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے"۔ دوسری روایت میں چوتھی نشانی بھی آئی ہے کہ جب جھگڑا کرے تو گالی دے۔

اپنے جذبات پر کنٹرول نہ کرنا بھی خیانت ہے۔ ابتدائے اسلام میں روزہ دار رات کے وقت بھی اپنی بیوی کے پاس نہیں جا سکتا تھا۔ بعض صحابہؓ سے اس پابندی کے بارے میں کوتاہی ہوئی۔ تب اللہ نے فرمایا:

عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُونَ أَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ۔

(البقرہ - ۱۸۷)

"اللہ جانتا تھا کہ تم اس بارے میں خیانت کرتے ہو، اب اس نے تمہاری طرف از راہ کرم توجہ فرمائی ہے (اور وہ پابندی ختم کر دی ہے)۔

کسی معاہدہ یا عہد کو پورا نہ کرنا بھی خیانت ہے۔ سورہ الانفال کی آیت ۵۸ میں ارشاد ہے۔

وَإِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْبِذْ إِلَيْهِمْ عَلَىٰ سَوَاءٍ

" اور اگر آپ کو کسی قوم کی طرف سے بدعہدی کا خوف ہو تو آپ بھی ان کی پابندیاں اسی طرح ان پر پھینک دیں۔"

یہاں خیانت سے مراد کسی معاہدے کی خلاف ورزی ہے۔

یہود کے اخفائے احکام، جھوٹی قسمیں کھانے اور جھوٹی شہادتیں دینے کو بھی خیانت کہا گیا ہے۔

وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ

(المائدہ ۵-۱۳)

" آپ ان اہل کتاب کی جھوٹی قسموں اور اخفائے احکام پر برابر مطلع ہوتے رہتے ہیں سوائے چند ایک کے۔"

الغرض ہر قسم کی چالاکیاں، مکاریاں، دھوکہ بازیاں، فراڈ، ہیراپھیریاں اور غبن، چاہے وہ چھوٹے ہوں یا بڑے سب کے سب خیانت میں شامل ہیں۔ حتیٰ کہ لالچ اور طمع جیسی بیماریاں بھی خیانت ہی ہیں نبی پاک نے خائن کی یہ تعریف کی ہے۔

اَلْخَآئِنُ الَّذِیْ لَا یَخْفٰی عَلَیْہِ طَمَعٌ وَّاِنْ دَقَّ اِلَّا خَانَہٗ

(مسند احمد جلد ۴ ص ۱۶۳)

" خیانت کار وہ ہے جس کا طمع پوشیدہ نہ رہ سکے وہ معمولی سے معمولی چیز میں بھی خیانت ضرور کرے گا۔"

اسی لئے اللہ تعالیٰ نے بار بار قرآن پاک میں ارشاد فرمایا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُوْرٍ - (الحج - ۳۸)

" بے شک اللہ تعالیٰ ہر خیانت کار اور انکاری کو پسند نہیں کرتا۔"

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا اَثِيْمًا (النساء - ۱۰۷)

" بے شک اللہ کسی بھی خیانت کار اور گناہ گار کو پسند نہیں کرتا۔"

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ - (سورہ الانفال - ۵۸)

" بے شک اللہ تعالیٰ خیانت کو پسند نہیں کرتا۔"

خیانت کا دائرہ کار محض عقائد اعمال اور معاملات تک ہی محدود نہیں بلکہ اس کی لپیٹ میں انسان کا

اپنا جسم بھی آجاتا ہے۔ مثلاً آنکھ۔ پیر۔ کان۔ زبان اور ہر ہر عضو کی خیانت ہوسکتی ہے اور بعض اوقات انسان اپنی مکمل ذات سے بھی خیانت کرتا ہے اس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ اپنے اعضاء کو غیر شرعی طریقہ پر استعمال کرے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ جب وہ کسی سے خیانت کر رہا ہوتا ہے تو وہ فی الحقیقت اپنے آپ سے خیانت کر رہا ہوتا ہے۔ [له] کیونکہ اس خیانت کا وبال و ضرر اسی پہ لوٹ کر آتا ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے۔

وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ (النساء - ۱۰۷)

"آپ ایسے لوگوں کی طرف سے جھگڑا نہ کریں جو خود اپنے ساتھ خیانت کرتے ہیں"۔

ایسے انسان کی پستی اور ہلاکت کا اندازہ کیسے لگایا جا سکتا ہے جو اپنی ذات کے ساتھ خیانت پہ تلا ہوا ہے۔ اس اخلاقی مرض سے نجات کا ایک ہی طریقہ ہے کہ خدا کی دانا اور قادرِ مطلق ہستی کو ہمیشہ پیش نظر رکھا جائے جس کی شان یہ ہے کہ:

يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ - (غافر - ۱۹)

"وہ ذات آنکھوں کی خیانت اور دلوں کے پوشیدہ رازوں کو جانتی ہے"۔

خود حضور پاکؐ نے ہجرت سے قبل لوگوں کی امانتوں کو واپس کرنا فرض عین سمجھا۔ حالانکہ اگر آپؐ امانتیں واپس نہ کرتے تو کوئی کافر آپ کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا تھا لیکن صادق و امین نے خیانت کو شانِ انسانیت کے خلاف سمجھا اور حضرت علیؓ کو تمام امانتیں واپس کرنے کا حکم دیا۔ سورہ بقرہ میں ارشاد ہے۔

فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهُ

(۲۸۳)

"اگر تم میں سے کوئی دوسرے پر اعتبار کرے تو جس کے پاس امانت رکھی جائے وہ اسے واپس کر دے"۔

قرآن پاک میں دو جگہ پہ ارشاد ہوتا ہے۔

[له] تفہیم القرآن ج ۱۔ ص ۳۹۴۔ حاشیہ ۱۴۱

وَالَّذِیۡنَ هُمۡ لِاَمٰنٰتِهِمۡ وَعَهۡدِهِمۡ رٰعُوۡنَ -

(المؤمنون - ۸، المعارج - ۳۲)

مومن وہ ہیں جو اپنی امانتوں اور عہد کا پاس کرنے والے ہیں"

اِنَّ اللّٰهَ یَاۡمُرُکُمۡ اَنۡ تُؤَدُّوا الۡاَمٰنٰتِ اِلٰۤی اَهۡلِهَا (سورہ النساء - ۵۸)

"بے شک اللہ تعالیٰ تم کو امانتیں ان کے اہل کو ادا کرنے کا حکم دیتا ہے"۔

ابن عباس اور محمد بن خلیفہ فرماتے ہیں کہ یہ حکم ہر برّ و فاجر مسلمان کے لئے ہے۔ امام قرطبی فرماتے ہیں "یہ آیت امہات احکام میں سے ہے اس میں تمام دین و شرع کو سمویا گیا ہے اس کا عموم تمام لوگوں پر حاوی ہے[1]"

اس سلسلہ میں طبری نے جو کچھ کہا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

"یہاں جن لوگوں کو امانتیں لوٹانے کا حکم دیا گیا ہے وہ مسلمانوں کے والی، اولوالامر اور سلطان ہیں۔ ان کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ عوام کے حقوق ادا کریں۔ مثلاً ان کے مابین قضایا میں عدل و انصاف کا مظاہرہ کریں۔ ان کے اموال کو ایمانداری کے ساتھ جمع کرکے ان میں مساوی طور پر تقسیم کریں۔ ان کی شکایات کا ازالہ کریں اور ان سے ناحق کوئی شے نہ لیں[2]"

مندرجہ بالا تفسیر کی رو سے مسلمانوں کے صدور، وزراء، سیکرٹری، گورنر اور کمشنر وغیرہ سبھی پر انتہائی اہم ذمہ داری ڈالی گئی ہے۔ گویا سیاست دان اور انتظامیہ اور عدلیہ کے تمام ذمہ دار افراد اگر اپنے عوام کے حقوق غصب کرتے ہیں تو وہ بددیانتی اور خیانت کے مجرم قرار پاتے ہیں۔

امام رازی نے اس آیت کی تفسیر میں جو کچھ ضیا پاشی کی ہے وہ ہمارے بیان کا مکمل خلاصہ ہے۔ ملاحظہ ہو:

"اس آیت میں مومنوں کو تمام امور میں ادائے امانت کا حکم دیا گیا ہے چاہے وہ امورِ دین سے متعلق ہوں یا دنیاوی معاملات سے متعلق ہوں۔ یہ بات بھی پیش نظر ہے کہ

[1] تفسیر ماجدی - ص ۱۹۷ [2] تفسیر طبری، ج ۵ ص ۱۴۴ تا ۱۴۶ - طبع مصر

اس سے پہلی آیت میں اہلِ ایمان اور اعمال صالحہ کرنے والوں کے لئے ثوابِ عظیم کا مژدہ سنایا گیا ہے انہی اعمالِ صالحہ میں ایمانداری بھی شامل ہے“۔

”فتح مکہ کے وقت آپؐ نے کلید کعبہ اپنے چچا حضرت عباسؓ کو دینا چاہی تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی اور آپؐ نے کلید کعبہ عثمان بن طلحہؓ کے حوالے کر دی۔“

”لیکن اس آیت کا نزول اسی واقعہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ اس میں ہر قسم کی امانتیں شامل ہیں“۔

”ایک انسان کا معاملہ یا تو اس کے رب کے ساتھ ہوگا یا تمام مخلوقِ خدا سے ہوگا یا پھر خود اپنی ذات کے ساتھ ہوگا۔ ان تینوں معاملات میں امانت کی رعایت واجب ہے جہاں تک رب کے ساتھ امانت داری کا تعلق ہے تو انسان کو تمام مأمورات پر عمل کرنا چاہیئے اور تمام منہیات سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ یہ مأمورات اور منہیات تو بحرِ بے کنار ہے“۔

ابن مسعودؓ فرماتے ہیں ”امانت کی رعایت کرنا تو ہر چیز میں لازمی ہے۔ وضو، جنابت، نماز زکوٰۃ اور روزہ وغیرہ میں“۔ ابن عمرؓ فرماتے ہیں ”اللہ تعالیٰ نے انسان کی شرمگاہ پیدا کر کے اسے کہا یہ میری امانت ہے جو میں تمہارے پاس چھپا کر رکھ رہا ہوں اس کی حفاظت کرتے رہنا اِلّا یہ کہ اسے جائز جگہ استعمال کرنا پڑے“۔

”جان لو کہ یہ باب بھی بہت وسیع ہے۔ زبان کی امانت یہ ہے کہ اسے کِذب، غیبت چغل خوری، کفر، بدعت اور فحش گوئی میں صرف نہ کیا جائے۔ آنکھ کی امانت یہ ہے کہ اسے حرام اشیاء کی طرف نہ پھیرا جائے۔ کان کی امانت یہ ہے کہ اسے ملاہی و مناہی اور فواحش اکاذیب کے سننے میں استعمال نہ کیا جائے“۔ یہی حکم باقی تمام اعضاء پر صادق آتا ہے۔

”جہاں تک مخلوق خدا کے ساتھ امانت داری کا تعلق ہے تو اس میں اپنے پاس رکھی ہوئی کسی کی شئے کو واپس کرنا ہے۔ ناپ تول میں کمی سے پرہیز کرنا ہے۔ لوگوں پر ان کے عیوب نہ اچھالے جائیں۔ امراء اپنی رعیّت کے ساتھ عدل کا مظاہرہ کریں۔ علماء عوام کے ساتھ انصاف سے کام لیں۔ انہیں حق بات بتائیں۔ عوام کو باطل تعصبات پر نہ ابھاریں بلکہ وہ عوام کو ایسے اعتقادات اور اعمال سے روشناس کریں جو ان کی دنیاوی اور اُخروی زندگی کے لئے سودمند

ثابت ہوں۔ اسی حکم میں یہود کو خیانت سے روکا گیا ہے کہ وہ محمدؐ کے بارے میں حق کو پوشیدہ نہ رکھیں۔ اس میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ کفار سے یہ نہ کہیں کہ تمہارا دین تو محمدؐ کے دین سے افضل ہے۔ اسی آیت کے تحت بیوی کا اپنی عصمت کو محفوظ رکھنا آتا ہے اور وہ کسی ایسے بچے کو خاوند کی طرف منسوب نہ کرے جو خاوند سے نہیں ہے۔ اور اپنی عدت کے ختم ہوجانے کے بارے میں کوئی بات پوشیدہ نہ رکھے۔

جہاں تک انسان کا خود اپنے ساتھ امانت داری کا تعلق ہے تو وہ اپنی ذات کے لیے وہی چیز پسند کرے جو دین و دنیا کے لحاظ سے نافع و اصلح ہو۔ وہ شہوت وغضب کے طوفان کی لپیٹ میں آکر کسی ایسی چیز کو پسند نہ کر بیٹھے جو اس کی آخرت کے لیے ضرر رساں ثابت ہو۔ نبیؐ پاک فرمایا کرتے تھے "کُلُّکُمْ رَاعٍ وَّکُلُّکُمْ مَسْؤُلٌ عَنْ رَعِیَّتِہٖ" تم میں سے ہر ایک رکھوالا ہے اور ہر ایک سے اس کی ماتحت چیزوں کے بارے میں پوچھا جائے گا۔" امانت داری کا معاملہ اس قدر عظیم ہے کہ حق جلّ شانہٗ نے اسے کئی بار قرآن پاک میں ذکر کیا ہے۔ نبیؐ پاک نے فرمایا ہے۔" لا ایمان لمن لا امانۃ لہٗ" اس شخص کا ایمان ہی نہیں جس میں امانت داری نہیں ہے۔"[1]

مخلوقِ خدا کے ساتھ ایمانداری کو ہم زیادہ واضح انداز میں یوں بھی بیان کر سکتے ہیں کہ ایک انسان یا تو کسی گھرانے کا فرد ہے مثلاً بھائی ہے، بیٹا ہے یا باپ ہے۔ ان تمام حیثیتوں کے فرائض بطریقِ احسن پورا کرنا امانت داری ہے۔ اس کے بعد وہ پورے معاشرے کا ایک فرد ہے۔ تمام معاشرتی فرائض کو پورا کرنا امانت داری ہے۔ مزید آگے بڑھیں تو پورے شہر یا ملک کا ایک باشندہ ہے۔ لہٰذا اس پر شہری فرائض کو پورا کرنا واجب ہے۔ ملک کے دستور اور قوانین کا احترام کرنا امانت داری ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو قرآن کی رُو سے وہ خیانت کار تصور ہوگا۔

وَمَا عَلَیْنَا اِلَّا الْبَلَاغ

---

[1] اقتباسات از تفسیر کبیر۔ جلد ۱۰، ص ۱۳۷ تا ۱۳۹۔

تاثیرِ قرآن
نفوسِ انسانی پر

میر محمد حسین - ایم - اے - فاضل دیوبند

ہم عجمی ہیں اور قرآن مجید عربی۔ ہمارا معاملہ کچھ ایسا ہے کہ " زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم"
قرآن مجید کے الفاظ کی ساخت، ان کی باہمی بندش و ترکیب اور اس کے اسلوب میں کچھ ایسی حلاوت و غنائیت ہے کہ ایک عام آدمی بھی کسی خوش گلو قاری کو قرآن پڑھتے سُن کر جھومنے لگتا ہے۔ برصغیر کا یہ واقعہ کسی پڑھے لکھے آدمی سے مخفی نہیں کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم جب اپنی مخصوص لَے میں قرآن مجید تلاوت کرتے تھے تو یہاں کے ہندو اور سکھ بھی سُن کر مسحور ہو جاتے اور گھنٹوں تک پوری محویت کے ساتھ کھڑے سُنتے رہتے۔ آج بھی جب حسنِ قرات کی محفلیں جمتی ہیں تو مجموں پر وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

قرآن مجید کی ہم عجمیوں پر یہ تاثیر اس کے باوجود ہے کہ ہم نہ اس کے معانی کو سمجھتے ہیں اور نہ اس کی فصاحت و بلاغت کا ادراک رکھتے ہیں۔ اگر کسی کو یہ دولت بھی نصیب ہو تو قرآن مجید سُن کر اس کی کیا کیفیت ہو۔ اس کا اندازہ ان عربوں سے پوچھیے جن کی نہ صرف مادری زبان عربی تھی بلکہ انہیں اپنی سخن آوری پر اس قدر ناز تھا کہ وہ پوری دُنیا کو اپنے مقابلے میں عجم (بے زبان) تصور کرتے تھے۔

انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جو الزامات عائد کیے، ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ یہ شخص (ساحر) جادوگر ہے۔ یہ الزام خود بتا رہا ہے کہ لسانِ رسالت سے قرآن مجید سُن کر

ان کے دل اس طرح بے اختیار اس کی طرف کھنچے چلے جاتے تھے جیسے کسی نے ان پر جادو کر دیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے لوگوں سے کہتے :

لَا تَسْمَعُوا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ ۴۱/۲۶

کہ اس قرآن کو مت سنو! بلکہ جب یہ پڑھا جا رہا ہو تو خوب غل غپاڑہ مچاؤ تاکہ تم پر یا کسی دوسرے پر اس کا اثر نہ ہونے پائے۔ تمہارے غالب رہنے کی یہی ایک صورت ہو سکتی ہے اور اسی لیے وہ مکہ میں ہر نووارد کو نصیحت کرتے کہ اپنے کانوں میں روئی ٹھونس لو کیونکہ یہاں محمدؐ نامی ایک شخص اپنے کلام کے زور سے لوگوں پر جادو کر دیتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ پانچ سال تک اگر اسلام نہیں لائے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اپنے آبائی دین میں تصلب کی وجہ سے انہوں نے اپنے کان میں قرآن کی آواز پڑنے ہی نہیں دی۔ جونہی اپنی بہن کے گھر میں یہ آواز ان کے کان میں پڑی، ان کے دل کی دنیا بدل گئی۔ اور وہ جو شمشیر بکف ہو کر گھر سے نکلے تھے کہ آپ کا کام تمام کر دیں گے اب گردن بزیر ہو کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

کفارِ مکہ کی ایذا رسانیوں سے تنگ آ کر حضرت ابوبکرؓ مکہ سے باہر جانے لگے تو ابن الدغنہ نے کہا : آپ جیسے شریف انسان کا مکہ سے چلے جانا اہلِ مکہ کی بدنصیبی ہوگی۔ آج سے آپ میری امان میں ہیں۔ پوری آزادی کے ساتھ اپنے دین پر عمل کریں۔ کسی کو آپ کے درپئے آزار ہونے کی جرأت نہ ہوگی۔ روایات میں ہے کہ حضرت ابوبکرؓ جب رات کو نماز کے لیے کھڑے ہوتے اور قرآن مجید کی تلاوت کرتے تو پاس سے گزرنے والا ہر شخص اسے سن کر متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔ یہ دیکھ کر اہلِ مکہ چیخ اٹھے کہ ابوبکرؓ کی اس تلاوتِ قرآن سے ہماری عورتیں، بچے اور نوجوان آبائی دین سے منحرف ہوئے جاتے ہیں۔ اکٹھے ہو کر ابن الدغنہ سے کہا کہ ابوبکرؓ کو ایسا کرنے سے روکو ورنہ پوری قوم صابی ہو جائے گی۔ چنانچہ ابن الدغنہ کو حضرت ابوبکرؓ کو دی گئی امان سے دست بردار ہونا پڑا۔

ولید بن مغیرہ نے ایک روز رؤسائے قریش سے کہا : آج رات میں اس شخص (محمدؐ) کا جائزہ لے کر تمہیں بتاؤں گا۔ چنانچہ وہ ایسے وقت پہنچا جب آپ نماز میں قرآن مجید پڑھ رہے

تھے۔ دیر تک کھڑا سنتا رہا۔ واپس لوٹا تو لوگوں سے کہنے لگا: "میں نے ایک شیریں، شاداب اور بار آور کلام سُنا ہے جو دلوں میں اُترا چلا جاتا ہے"۔ انہوں نے سوال کیا: تو کیا وہ شعر ہے؟ اس نے کہا: مجھ سے بڑھ کر شعر کا شناسا کون ہو سکتا ہے: خدا کی قسم! وہ شعر نہیں۔ انہوں نے پوچھا: تو کیا محمدؐ کاہن ہے اور اس کا یہ کلام کہانت کی کوئی قسم ہے؟ اس نے جواب دیا: ہرگز نہیں کیوں کہ میں کہانت سے بھی خوب واقف ہوں۔ انہوں نے کہا: تو کیا وہ جادو ہے؟ کہنے لگا: میں نہیں جانتا، لیکن اگر وہ (مخلوق کے کلام کی قسموں میں سے) کوئی چیز ہو سکتا ہے تو وہ جادو ہی ہے۔

خالد بن عقبہ نے قرآن مجید سن کر اس پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا کہ:۔

"واللہ ان لہ لحلاوۃ وان علیہ لطراوۃ وان اسفلہ لمغدق وان اعلاہ لمثمر وما یقول ھذا بشر"

خدا کی قسم! اس میں ایک عجیب مٹھاس ہے اور اس میں ایک عجیب ترو تازگی ہے۔ اس کی جڑیں شاداب اور اس کی شاخیں پھلوں سے لدی ہوئی ہیں اور ایسا کلام کوئی انسان نہیں کہہ سکتا۔

کہتے ہیں ایک دفعہ قریش کے تین بے مثال بلیغ خطیب — ولید بن مغیرہ، اخنس بن قیس اور ابوجہل — مختلف مقامات سے رات کے وقت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے گھر میں قرآن مجید پڑھتے ہوئے سُنتے رہے یہاں تک کہ صبح ہوگئی۔ واپسی پر جب ان کی باہم ملاقات ہوئی تو انہوں نے ایک دوسرے کو (اس حرکت پر) ملامت کی اور کہا کہ اگر عوام ہمیں ایسا کرتے ہوئے دیکھ لیں اور وہ بھی قرآن سننے لگیں تو وہ فوراً ایمان لے آئیں۔ دوسری شب کو بھی انہوں نے یہی کچھ کیا اور پھر جب باہم ملے تو پہلے سے بھی زیادہ اس حرکت پر شرمسار ہوئے اور قسم کھائی کہ آئندہ ایسا نہیں کریں گے۔ دن چڑھا تو ولید بن مغیرہ، اخنس بن قیس کے پاس آیا اور کہنے لگا: جو کچھ تم نے محمدؐ سے سُنا، اُس کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے۔ اُس نے کہا: "میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ بنو عبدالمطلب نے کہا: ہم حاجب ہوں گے۔ ہم نے تسلیم کر لیا۔ انہوں نے کہا: ہم خانہ کعبہ کے متولی ہوں گے، ہم مان گئے۔ انہوں نے حاجیوں کی سقائی کا کام اپنے ذمے لیا۔ ہم نے مزاحمت نہ کی۔ اب وہ کہتے ہیں کہ ہم

میں نبی بھی آیا ہے جس پر وحی نازل ہوتی ہے۔ خدا کی قسم! میں تو اس پر ہرگز ایمان نہیں لاؤں گا"
یہ واقعہ بتا رہا ہے کہ رموزِ سخن سے آشنا ان لوگوں کے دلوں میں قرآن مجید نہ صرف اپنے مضامین بلکہ اپنی فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے بھی اُتر چکا تھا، مگر اُن کی وہ شعوبی عصبیتِ جاہلیہ آڑے آتی رہی اور وہ ایمان نہ لائے۔

ثمامہ بن آثال، منافقین کے پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر کہا کرتا تھا کہ میرے لیے محمدؐ کے چہرے سے زیادہ مبغوض کوئی چہرہ نہیں اور اس کے شہر (مدینہ) سے بڑھ کر کوئی شہر قابلِ نفرت نہیں، مگر جب گرفتاری کے بعد دو ہی روز تک مسجد نبوی میں براہ راست آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے قرآن مجید سُننے کا اتفاق ہوا تو اب یہ کیفیت تھی کہ اس کے لیے حضوؐر کی ذات سے بڑھ کر کوئی ذات محبوب نہ تھی اور مدینہ سے بڑھ کر اسے کوئی شہر عزیز نہ تھا۔

ملک الشعراء ولید جس کے بعض شعروں پر، کہتے ہیں کہ شاعر اس کے سامنے سربسجود ہو گئے تھے، قرآن مجید سے اس قدر متاثر تھا کہ ایک ملاقات میں جب حضرت عمرؓ نے اس سے اپنا تازہ کلام سُنانے کی فرمائش کی تو کہنے لگا کہ جب سے قرآن سُنا ہے، شعر کہنا چھوڑ چکا ہوں۔ بالفاظ دیگر، قرآن مجید کے معجزانہ اسلوب کو دیکھ کر اس عظیم شاعر کو اپنا کلام حقیر دکھائی دینے لگا۔ جنّوں کے اس تاثر میں کتنی حقیقت اور کتنی گہرائی ہے کہ:

إِنَّا سَمِعْنَا قُرْآنًا عَجَبًا (الجن)

احتیاط

ترجمان القرآن میں ضرورتِ استدلال کے لیے آیات و احادیث شائع ہوتی رہتی ہیں ۔ قارئین سے گذارش ہے کہ جن اوراق پر آیات و احادیث ہوں۔ ان کا خاص احترام ملحوظ رکھیں تاکہ بے ادبی نہ ہونے پائے۔

(ادارہ)

الدُّعا

عبدالرشید ارشد، ریاض[1]، سعودی عرب

دُعا عبادت ہے بلکہ عبادت کا مغز (مخ العبادۃ)۔ قرآن کا آغاز بھی دُعا سے ہوتا ہے، اس کا اختتام بھی ایک دُعائی تعلیم پر کیا گیا ہے اور قرآن کے اندر بھی جا بجا انبیاء و صلحا کی دُعائیں بھی مذکور ہیں اور خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے براہِ راست تلقین کردہ دعائیں بھی۔

دُعا انسانی ضرورت بھی ہے۔ دُعا معاش کے لیے بھی، معاد کے لیے بھی، اس دُنیا کے لیے بھی، اور آخرت کے لیے بھی، حصولِ خیر و فلاح کے لیے بھی اور دفعِ شر کے لیے بھی، تغیرِ احوال کے لیے بھی اور تسکینِ دل اور صبر و قناعت کے لیے بھی۔

دُعا کے بارے میں قرآن و حدیث کی تعلیمات کی ایک جھلک اس مضمون میں پیش کی جا رہی ہے۔

ذکر اور دُعا ذکر میں اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا اور اس کی صفات کا یقین کرنا، اس کی پچھلی نوازشاتِ بے حساب پر تشکر اور آئندہ کے لیے اس پر بھروسہ اور توکل کرنا، عالمِ تکوین اور تاریخ میں آیاتِ الٰہی پر نظر جمانا اور آخرت کے احوال کا تصور کرنا وغیرہ امور شامل ہیں۔ یہ چیزیں گویا مستقل قرب کا ذریعہ ہیں۔ ان کے ہوتے ہوئے دُعا کرنے والا اس حیثیت میں خدا کے سامنے پیش نہیں ہو رہا ہوتا کہ ضرورت و مصیبت پڑی تو چلے دُعا کرنے کو، اور وقت گذر گیا تو پھر گویا کوئی واسطہ ہی نہیں۔ ذکر ایک مستقل رابطے کا ذریعہ ہے اللہ تعالیٰ سے۔ ذکر میں دعا بھی شامل ہوتی ہے اور دُعا میں ذکر۔ دونوں یکجا ہوں تو حقیقی فلاح نصیب ہوتی ہے۔

قرآن میں بیانِ ذکر ذکر کی اس اہمیت پر خالق نے اپنی کتاب میں جگہ جگہ یوں توجہ دلائی ہے۔

---

[1] موصوف اب حال ہی میں ریاض سے جوہر آباد ضلع خوشاب میں منتقل ہو چکے ہیں۔ (ادارہ)

—— فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ ؀ [1]

(سو تم مجھے یاد کیا کرو، میں تمہیں یاد کیا کروں گا اور میرا احسان ماننا اور ناشکری نہ کرنا،

—— ... فَاذْكُر رَّبَّكَ كَثِيرًا وَسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْإِبْكَارِ ؀ [2]

("... اور اپنے پروردگار کی کثرت سے یاد اور صبح شام اس کی تسبیح کرنا")

—— وَاذْكُر رَّبَّكَ فِي نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَخِيفَةً وَدُونَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ ...... ؀ [3]

(اور اپنے پروردگار کو دل ہی دل میں عاجزی اور خوف اور پست آواز سے صبح و شام یاد کرتے رہنا)۔

—— إِنَّنِي أَنَا اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدْنِي وَأَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي ؀ [4]

(بے شک میں ہی خدا ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں، تو میری عبادت کیا کرو اور میری یاد کے لیے نماز پڑھا کرو۔)

—— وَمَنْ أَعْرَضَ عَن ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنكًا وَ...... ؀ [5]

(اور جو میری نصیحت (میرے ذکر) سے منہ پھیرے گا اس کی زندگی (معیشت) تنگ ہو جائے گی اور ......)

—— أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا أَن تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللَّهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ...... [6]

(کیا ابھی مومنوں کے لیے اس کا وقت نہیں آیا کہ اللہ کے ذکر اور حق میں سے نازل کیے ہوئے سے اُن کے دل ڈریں۔)

—— يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِن يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ۚ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ؀

---

[1] البقرہ - ۵۲
[2] آل عمران - ۴۱
[3] الاعراف - ۲۰۵
[4] طٰہٰ - ۱۴
[5] طٰہٰ - ۱۲۴
[6] الحدید - ۱۶

فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ [1]

(مومنو! جب جمعے کے دن نماز کے لیے اذان دی جائے تو خدا کی یاد (نماز) کے لیے جلدی کرو اور (خرید و) فروخت ترک کر دو، اگر سمجھو تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے، پھر جب نماز ہو چکے تو اپنی اپنی راہ لو اور خدا کا فضل تلاش کرو اور خدا کو بہت بہت یاد کرو تاکہ (فلاح) نجات پاؤ۔)

— يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ..... [2]

(مومنو! تمہارے مال اور تمہاری اولاد تم کو خدا کی یاد سے غافل نہ کر دے ....)

مذکورہ بالا آیات بڑی وضاحت کے ساتھ، ذکر کے مقام اور مفاہیم و معنی کا تعین کرتی ہیں۔ ان آیات کی روشنی میں یہ بات پورے وثوق و اعتماد کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس مطلوب ذکر کا متعین طور پر کوئی مخصوص انداز نہیں ہے بلکہ مومن کی زندگی کے صبح و شام کے تمام تر اعمال میں اس کی مقرر کردہ حدود و قیود کی پابندی کرنا، ہر لمحہ اس کے انعامات اور احسانات کو یاد کر کے شکر (زبانی اور عملی) ادا کرنا، نافرمانی کے تصور سے بھی دُور بھاگنا اور بدقسمتی سے کچھ سرزد ہو ہی جائے تو سجدے میں سر رکھ کر سچے دل سے نادم ہوتے ہوئے توبہ و استغفار کرنا، حقیقی ذکر ہے۔ ذکر کی تمام دوسری کیفیات، ماسوائے نماز اور زکوٰۃ کے، ذکر یہ اجتماعی طور پر ہی مطلوب ہیں اور اس طلب کے پیچھے عظیم تر مصلحتیں ہیں) انفرادی ہیں، مگر اس انفرادی ذکر سے شخصیت میں پیدا ہونے والا نکھار اجتماعی معاشرتی زندگی پر بھرپور اثر انداز ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے تعلق پکا کرنے میں نماز اور زکوٰۃ کے بعد ہی انفرادی ذکر سب سے زیادہ مؤثر بھی ہے اور پسندیدہ بھی، جس سے تقویٰ کی زندگی پیدا ہوتی ہے۔

---

[1] الجمعۃ۔ ۹، ۱۰

[2] المنافقون۔ ۹

٭ روزہ و حج میں بھی ذکر اور عبادت کے اجتماعی پہلو موجود ہیں (ترجمان القرآن)

اہل ذکر سے متعلق آیات | ربّ العزت نے اپنی کتاب میں " ذاکرین" کا ذکر بھی فرمایا ہے، جنہیں اس نے فلاح یافتہ اور ہدایت یافتہ کے عظیم ترین خطابات سے بھی نوازا ہے ۔ آیئے قرآن کے آئینے میں ذاکرین کو دیکھیں، اس سے کم از کم اپنی حیثیت متعین کرنے میں مدد ملے گی :۔

— وَالَّذِیْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَۃً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَھُمْ ذَکَرُوا اللّٰہَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِھِمْ ...... [1]

(یہ ایسے لوگ ہیں کہ جب کوئی کھلا گناہ یا اپنے حق میں کوئی برائی کر بیٹھتے ہیں تو خدا کو یاد کرتے اور اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں ......)

— اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِھِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ج رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا ج سُبْحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ [2]

(جو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے (ہر حال میں) خدا کو یاد کرتے ہیں اور آسمان و زمین کی پیدائش پر غور کرتے اور کہتے ہیں کہ اے پروردگار تو نے اس (مخلوق) کو بے فائدہ نہیں بنایا، تُو پاک ہے پس تُو (قیامت کے دن) ہمیں دوزخ سے بچائیو۔)

— اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتْ قُلُوْبُھُمْ ...... [3]

(مومن تو وہ ہیں کہ جب خدا کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں ......)

— اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُھُمْ بِذِکْرِ اللّٰہِ ط اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ [4]

(جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور جن کے دل یاد خدا سے آرام پاتے ہیں اور سن لو کہ خدا کی یاد سے دل آرام پاتے ہیں)۔

---

[1] آل عمران - ۱۳۵ — [2] آل عمران - ۱۹۱

[3] الانفال - ۲ — [4] الرعد - ۲۸

—— وَالَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوا عَلَيْهَا صُمًّا وَعُمْيَانًا ۝[1]

(اور وہ کہ جب اُن کو خدا کی باتیں سمجھائی جاتی ہیں تو اُن پر اندھے بہرے ہو کر نہیں گرتے (بلکہ غور و فکر سے سنتے ہیں)۔

—— الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَالصَّابِرِينَ عَلَىٰ مَا أَصَابَهُمْ وَالْمُقِيمِي الصَّلَاةِ ۙ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ ۝[2]

(یہ وہ لوگ ہیں کہ جب خدا کا نام لیا جاتا ہے تو اُن کے دل ڈر جاتے ہیں اور جب اُن پر مصیبت پڑتی ہے تو صبر کرتے ہیں اور نماز پڑھتے ہیں اور جو رزق ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں)۔

—— ......وَالذَّاكِرِينَ اللَّهَ كَثِيرًا وَالذَّاكِرَاتِ أَعَدَّ اللَّهُ لَهُم مَّغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا ۝[3]

(..... اور خدا کو کثرت سے یاد کرنے والے مرد اور کثرت سے یاد کرنے والی عورتیں اللہ نے ان کے لیے بخشش اور اجر عظیم تیار کر رکھا ہے)۔

تارکین ذکر کا تذکرہ

ذکر اور ذاکرین کے ذکر کے بعد کتاب اللہ ہی سے غیر ذاکرین یا تارکین ذکر کا ذکر کرنا بھی بے موقع اور بے فائدہ نہ ہوگا کہ راہوں کے تعین میں، اسے بھی ہر پہلو سے بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ لیجیے چند مثالیں بھی ملاحظہ فرمایئے۔

—— .....وَإِذَا قَامُوا إِلَى الصَّلَاةِ قَامُوا كُسَالَىٰ يُرَاءُونَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُونَ اللَّهَ إِلَّا قَلِيلًا ۝[4]

(..... اور جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو سست اور کاہل (صرف) لوگوں کو دکھانے کے لیے، اور خدا کو یاد ہی نہیں کرتے، مگر بہت کم)۔

—— وَإِذَا ذُكِّرُوا لَا يَذْكُرُونَ ۝[5]

(اور جب اُن کو نصیحت دی جاتی ہے تو نصیحت قبول نہیں کرتے)۔

۱؎ الفرقان - ۷۳ ۲؎ الحج - ۳۵ ۳؎ الاحزاب - ۳۵ ۴؎ النساء - ۱۴۲
۵؎ الصّٰفّٰت - ۱۳

—— إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِالذِّكْرِ لَمَّا جَاءَهُمْ ۖ وَإِنَّهُ لَكِتَابٌ عَزِيزٌ [۱]

(جن لوگوں نے نصیحت کو نہ مانا جب وہ اُن کے پاس آئی ، یہ تو ایک عالی رتبہ کتاب ہے)۔

دُعا و ذکر کا تعلق دعا ، ندا ، سوال اور ذکر کے مابین اتنا قریبی اور گہرا تعلق ہے کہ ان کو الگ الگ کرنا محال ہے۔ یہ باہم لازم و ملزوم ہیں ، ہم یہاں مثال کے طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک فرمان پیش کرتے ہیں جو ہماری بات کی بلا واسطہ تائید کرتا ہے۔ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم افضل الدعاء اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ [۲] اب یہ جملہ نمایاں طور پر اگر دعا ہے تو ذکر بھی ہے۔ مانگنے ہی کے ضمن میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان مانگنے والوں میں اعتماد پیدا کرتا ہے یہ کافی ہے کُنْ عَبْدًا رَبَّانِیًّا فَاِنَّکَ اِذَا قُلْتَ یَا رَبِّ قَالَ اللہُ تَعَالٰی لَبَّیْکَ عَبْدِیْ سَلْ تُعْطَ (تو اللہ کا فرمانبردار بن تاکہ جب تو اپنی حاجت کے لیے پکارے تو اللہ تعالیٰ فرمائے ، میرے بندے میں موجود ہوں ، مانگ میں تجھے دوں گا) یعنی جس سے کچھ لینا ہو اُس کی فرمانبرداری لازمی ہے ، اس پر تو دنیا کے تجربات بھی شاہد ہیں۔

ذکر ہی کے عنوان پر چند احادیث بیان کر دینا بھی یقیناً نفع بخش ہوگا۔ ہم مختلف کتبِ حدیث سے ایک گلدستۂ ذکر ترتیب دیتے ہیں۔

—— قَالَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللہَ تَعَالٰی یَقُوْلُ اَنَا مَعَ عَبْدِیْ اِذَا ذَکَرَنِیْ تَحَرَّکَتْ بِیْ شَفَتَاہُ [۳]

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ، اللہ تعالیٰ کہتا ہے جب میرا بندہ مجھے یاد کرتا ہے ، اور میرے ذکر میں اُس کے دونوں ہونٹ ہلتے ہیں تو میں اپنے بندے کے ساتھ ہوتا ہوں)

—— قَالَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَثَلُ الَّذِیْ یَذْکُرُ وَالَّذِیْ لَا یَذْکُرُ مَثَلُ الْحَیِّ وَالْمَیِّتِ [۴]

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اُس شخص کی مثال جو اپنے رب کو یاد کرتا ہے

---

[۱] حٰم سجدہ ۔ ۴۱ [۲] بحوالہ الدعا المستجاب ، احمد عبدالجواد مصری ، صفحہ ۵

[۳] بخاری شریف ۔ ابوہریرۃ (بحوالہ سفینۂ نجات) [۴] بخاری و مسلم ۔ ابوموسیٰ اشعریؓ (بحوالہ سفینۂ نجات)

زندہ آدمی کی سی ہے اور اس شخص کی مثال جو اپنے رب کو یاد نہیں کرتا وہ مُردہ کی طرح ہے۔

—— قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ، یَقُوْلُ اللّٰہُ اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِیْ بِیْ، وَاَنَا مَعَہٗ اِذَا ذَکَرَنِیْ، فَاِنْ ذَکَرَنِیْ فِیْ نَفْسِہٖ ذَکَرْتُہٗ فِیْ نَفْسِیْ، وَاِنْ ذَکَرَنِیْ فِیْ مَلَاءٍ ذَکَرْتُہٗ فِیْ مَلَاءٍ خَیْرٍ مِّنْھُمْ، وَاِنْ تَقَرَّبَ اِلَیَّ شِبْرًا تَقَرَّبْتُ اِلَیْہِ ذِرَاعًا وَاِنْ تَقَرَّبَ اِلَیَّ ذِرَاعًا، تَقَرَّبْتُ اِلَیْہِ بَاعًا وَاِنْ اَتَانِیْ یَمْشِیْ اَتَیْتُہٗ ھَرْوَلَۃً۔[1]

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرا مومن، بندہ میرے بارے میں جیسا یقین رکھتا ہے ویسا ہی مجھے پائے گا، جب وہ مجھے یاد کرتا ہے میں اُس کے سامنے ہوتا ہوں، اگر وہ مجھے تنہائی میں چپکے چپکے یاد کرتا ہے تو میں بھی اُسے تنہائی میں یاد کرتا ہوں اور اگر وہ مجھے کسی مجمع میں یاد کرتا ہے تو میں اسے اس سے بہتر مجمع (فرشتوں کی محفل) میں یاد کرتا ہوں - اگر وہ میری طرف بالشت بھر بڑھتا ہے تو میں اس کی جانب ایک ہاتھ بڑھتا ہوں اور اگر وہ میری طرف ایک ہاتھ بڑھتا ہے تو میں اُس کی طرف چار ہاتھ بڑھتا ہوں اور اگر وہ میری طرف چل کر آتا ہے تو میں اُس کے قریب دوڑ کر آتا ہوں۔)

دُعا صرف اللہ کے حضور دُعا ہو یا ندا و سوال، اس کے دو متعین پہلو ہیں، مثلاً کسی کو پکار کر یا تو ہم اُسے کچھ بتانا چاہتے ہیں، اُس کی مدد کرنا چاہتے ہیں اور یا بصورتِ دیگر ہم خود مدد و استعانت کے طلب گار ہیں - جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے کہ ہم کچھ بتانا چاہیں، یا جن کو پکاریں اُن کی مدد کرنا چاہیں، یہ بڑی ہی بے بنیاد سوچ ہے کہ خالقِ کائنات تو "عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ" ہے یعنی دلوں کے اندر کی کیفیات سے باخبر ہے۔ - پوری کائنات مل کر بھی اُس کے علم میں ذرہ برابر اضافہ نہیں کر سکتی، وہ حاجت مند بھی نہیں کہ اُسے کسی چیز کی ضرورت ہو، وہ خود ہر کس و ناکس کو دینے والا ہے۔ اس سے بڑھ کر نہ کوئی داتا ہے، نہ دستگیر، نہ مددگار، نہ قوت والا، نہ حکمت والا، نہ قدرت والا اور نہ ہی انتقام لینے والا۔

---

[1] بخاری و مسلم - ابوہریرۃ (بحوالہ سفینۂ نجات)۔

واضح رہے کہ عام لین دین اور دنیوی معاملات کی حد تک انسانوں میں باہمی مدد و استعانت کے بغیر کارگہ حیات میں کام مشکل بن جاتا ہے لہٰذا ایسی صورتوں پر اُس دُعا و ندا اور سوال کا اطلاق نہیں ہوتا جس کی بات ہم کر رہے ہیں، بلکہ یہ جائز (مطلوب صورتیں ہیں۔ اس روز مرہ عمومی باہمی امداد کے روکنے کو اللہ تعالیٰ نے بھی ناپسند فرمایا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی۔ (چونکہ یہ ہمارے موضوع سے الگ دوسرا موضوع ہے لہٰذا اس پر مزید کچھ نہیں کہیں گے°)۔

(باقی)

° مادی ضروریات اور مادی وسائط و وسائل سے ہونے والے کاموں میں ایک آدمی دوسرے سے تعاون یا امداد طلب کر سکتا ہے، اسی کے لیے انسانوں کو انسانوں کی مدد و خدمت کرنے اور ماعون دینے، لوگوں کی تکلیف دور کرنے اور انفاق کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ لیکن اس دائرے سے باہر اور بالاتر اُمور میں صرف خدا ہی سے سوال کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً کوئی آدمی کسی سے ایک ہزار روپے قرض مانگ سکتا ہے، لیکن اس کی یہ مانگ پوری بھی ہو جائے یا وہ چاہے کہ اُسے ایک ہزار روپیہ کسی نادیدہ حلال ذریعہ سے مل جائے یا اُن کے لیے کوئی ذریعہ حصول پیدا ہو جائے تو یہ ایسے اُمور ہیں جن کے لیے خدا ہی سے درخواست کی جا سکتی ہے۔ ظاہر کی ہر سعی کے ساتھ اس کی کامیابی کی دُعا تو اللہ تعالیٰ ہی سے کرنا لازم ہے، کیونکہ مساعی کو کامیاب بنانے اور کامیابی کے اسباب جمع کرنے والا اور کوئی ہے نہیں۔ (ترجمان القرآن) سلہ ابراہیم۔ ۳۹۔

اجتہاد اور اُس کی عصری تطبیقات

جناب محمد امین صاحب ۔ ریاض ۔ سعودی عرب

حال ہی میں راقم کو اس علماء کنونشن کی مطبوعہ رو داد کا تفصیلی مطالعہ کرنے کا موقع ملا، جو ۴ اور ۵ جنوری ۱۹۸۴ء کو صدر پاکستان کی زیر صدارت اسلام آباد میں ہوا۔

اجتہاد کمیٹی اس کنونشن میں جو مختلف کمیٹیاں بنائی گئی تھیں ان میں ایک اجتہاد کمیٹی بھی تھی، اِس کمیٹی نے جو سفارشات پیش کیں اُن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ:

"پاکستان کے اندر ایسے جید علماء و فضلاء کا بورڈ تشکیل دیا جائے جن کی دیانت، تبحر علمی، تقوٰی، عربی زبان پر عبور اور علومِ قرآنی اور حدیثِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) میں اُن کا مطالعہ ہی نہ ہو بلکہ پاکستانی عوام بھی اُن پر پورا اعتماد رکھتے ہوں۔ نیز بورڈ کے علماء کی معاونت کے لیے اس بورڈ کو ملک کے اندر پیدا ہونے والے قانونی مسائل کے حل کے لیے استخراج و استنباط کی ذمہ داری سپرد کی جائے"[1]

اس تجویز پر بحث کرتے ہوئے جناب مولانا محمد تقی عثمانی صاحب، جج شرعی بنچ عدالتِ عظمٰی پاکستان نے فرمایا کہ اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ اسلام نے اجتہاد کے لیے عیسائیت کی طرح تو کسی اقتدارِ اعلیٰ کی تنظیم قائم نہیں کی اور یہ کہ اُن کے خیال میں کسی ایسے ادارے کا قیام مناسب

[1] تقاریر و تجاویز علماء کنونشن مطبوعہ وزارت مذہبی اُمور۔ صفحہ ۲۱۱۔

نہیں ہے جو اجتہاد کے معاملے میں حرفِ آخر کا درجہ رکھے اور پھر اس کے خلاف اجتہاد کرنے کا کوئی راستہ نہ رہے۔[1]

اس بات سے قطع نظر کہ جس کمیٹی نے یہ تجویز پیش کی تھی وہ ۲۷ علماء اور سکالرز پر مشتمل تھی، دراس میں ملک بھر کے جید علماء شامل تھے، ہم یہ سمجھتے ہیں کہ مولانا عثمانی صاحب کے نقطۂ نظر سے اتفاق کرنا مشکل ہے اور معاملے کی علمی اور عملی اہمیت کے پیش نظر یہ غیر مناسب نہ ہوگا، اگر اس پر ذرا تفصیلی غور کر لیا جائے۔

فقہ اسلامی کی تاریخی نمو

سوال یہ ہے کہ فقہ اسلامی کی تاریخی نمو جس طرح ہوئی کیا وہ ایک طے شدہ اور مثالی طریق کار تھا یا وہ حوادثِ زمانہ کے پیشِ نظر ان مخصوص حالات کے اندر ایک بہتر طریق کار تھا؟ (BEST IN THE SITUATION) اور کیا ان سیاسی اور اجتماعی حالات کے بدل جانے کے بعد معاملے پر از سرِ نو غور کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ ہمارے نزدیک دوسرا نقطۂ نظر صحیح ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ خلافتِ راشدہ میں اور خصوصاً حضرت ابوبکرؓ صدیق و عمر فاروق رضؓ کے زمانے میں جتنے بھی اجتہادی فیصلے ہوئے وہ "سرکاری" سطح پر ہوئے اور ان کی حیثیت "شورائی اجتہاد" کی تھی۔ اگرچہ ان میں آزادانہ بحث و مناظرہ ہوا، بعض حضرات نے کھلم کھلا خلیفۂ وقت (جو خود بھی مجتہد ہوتا تھا) کی رائے سے باصرار اختلاف کیا، لیکن فیصلہ بہر حال خلیفہ کی صدارت میں اور شوریٰ کی رائے سے ہوا۔

اب یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ خلافتِ راشدہ کا نظام جاری نہ رہ سکا اور اس نظام کو جاری رکھنے کی جد و جہد میں مُصلحینِ امت اور سیاسی حکمرانوں کے درمیان جو تصادم ہوا وہ بظاہر اس دوسرے فریق کی شکست پر منتج ہوا۔ اس کے ساتھ ہی حضرت امام حسینؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی شہادت پر جو صدمہ اُمت اور علماء و صلحاءِ اُمت کو پہنچا اور اس سے جو رویے مستحکم ہوئے انہوں نے اقتدار اور اہلِ علم میں ایک مستقل تفریق سی پیدا کر دی۔ علماء نے اقتدار سے قطعِ تعلق کر لیا اور مسجد و مدرسہ پر اپنی توجہ مرکوز کر دی اور سیاسی حکمران آہستہ آہستہ دُنیادار ہوتے گئے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بنو اُمیہ کے ابتدائی حکمرانوں میں جو علم اور دینی رسوخ موجود تھا وہ بعد میں معدوم ہوتا چلا گیا اور خلافت بھی

---

[1] تقاریر و تجاویز علماء کنونشن، مطبوعہ وزارت مذہبی اُمور، صفحہ ۲۱۱

وراثت میں بدل گئی ۔

ادارۂ شوریٰ کا خاتمہ اس تفریق کا ایک بڑا نقصان یہ ہوا کہ شوریٰ کا ادارہ ختم ہوگیا، حکمرانوں نے اپنی من مانی شروع کردی اور امورِ مملکت میں مشورے کے لیے وہ اپنے وزراء اور حکام پر تکیہ کرنے لگے ، لیکن جہاں تک دینی امور کا تعلق تھا چونکہ ایسے حکمران اور ایسی شوریٰ باقی نہ رہی جس پر عوام کو اعتماد ہوتا ۔ کیونکہ حکمران اپنی سیاسی اغراض کی خاطر اب ایک ایسی شوریٰ بنانے پر تیار نہ تھے جس کو کوئی قوت اور رسوخ حاصل ہوتا اور ان کی اپنی مرضی نہ چل سکتی ، لہٰذا عوام نے دینی مسائل میں علماء و صلحاءِ اُمت سے رجوع کرنا شروع کردیا اور اجتماعی شورائی پلیٹ فارم کی غیر موجودگی میں معاملات انفرادی فتاویٰ پر چلنے لگے اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے، کیونکہ وہ نظام صدیوں تک جاری رہا تا آنکہ پچھلی صدی ہجری میں اتاترک نے قبلئہ خلافت چاک کردی ۔ اِس کے بعد مسلمان ممالک آہستہ آہستہ مغربی قوموں کی سیاسی غلامی سے آزاد ہونا شروع ہوئے اور اب ان کی کثیر تعداد آزاد ہوچکی ہے ۔ کمزوری اور زیردستی کے بعد اب جو نہوض (اٹھان) کا دور شروع ہوا ہے اور اس میں جو سیاسی ادارے وجود میں آئے اور آرہے ہیں اُن کی اپنی خوبیاں اور کمزوریاں ہیں (جس طرح کہ پرانے وراثتی خلافتی نظام کی بعض خوبیاں اور کمزوریاں تھیں) ۔

موجودہ دَور کے مسلمان معاشروں کا المیہ یہ ہے کہ یہاں مغربی فکر اور مغربی تہذیب و تمدن کا غلبہ ہے ۔ ہمارے پڑھے لکھے لوگوں کی ایک بڑی تعداد (خصوصاً وہ لوگ جو قانون و سیاست اور انتظامِ مُلکی سے متعلق ہیں) مغرب کے اس تعلیمی اور تہذیبی اثرات کے حصار سے نکلنے پر قادر نہیں ہیں ، بلکہ اس کا ارادہ بھی نہیں رکھتے ۔ وجہ یہ ہے کہ اس میں انہیں نفسیاتی ، معاشی ، معاشرتی اور پیشہ وارانہ اُلجھنوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور قربانی دینا پڑتی ہے ۔

اس ضمن میں ایک تازہ مثال بے مصرف ثابت نہ ہوگی ۔ فقہ اسلامی کے ایک بڑے مؤید اور مفکر علامہ اقبالؒ کے فرزند ارجمند جناب ڈاکٹر جاوید اقبال نے رجو اتفاق سے پنجاب کی عدالتِ عالیہ کے چیف جسٹس بھی ہیں ; فرمایا ہے کہ اجتہاد کے لیے عربی دانی کی شرط ختم کردی جائے[1] ۔ (ادعا یہ کہ

---

[1] جسارت کراچی ۔ ۲۸ اکتوبر ۱۹۸۴ء ۔ سرگودھا بار سے خطاب ۔

وکلا اجتہاد کر سکیں ۔ کیونکہ قرآن و سنت کو سمجھنے کا دعویٰ تو ترجموں کی مدد سے بھی کیا جا سکتا ہے!)
اس موقع پر اقبال کا یہ شعر بہ تصرفِ ادنیٰ ضرور یاد آتا ہے کہ ؎
خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ "جدد" بے توفیق[۱]

ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب سے بصد ادب یہ پوچھنے کو جی چاہتا ہے کہ کیا وہ تصور کر سکتے ہیں کہ کوئی صاحب انگریزی قانون میں پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ لکھیں اور انہیں انگریزی زبان نہ آتی ہو یا یہ مطالبہ کیا جائے کہ ڈاکٹروں پر سے ایم بی بی ایس کی ڈگری حاصل کرنے کی شرط ختم کر دی جائے۔ ۔۔۔ بہر حال ذکر یہ ہو رہا تھا کہ ہمارے اکثر برسرِ اقتدار لوگوں پر مغربی تہذیب نے یہ جادو کر رکھا ہے کہ وہ اسے معیار سمجھتے ہیں اور اسلام نے جو معیار ہمیں دیئے ہیں اُن پر غور کرنے کے لیے وہ تیار ہی نہیں ہیں۔

اجتہاد کے لیے عربی زبان دانی کی اہمیت اب اسی اجتہاد، شوریٰ اور پارلیمنٹ کے مسئلے کو لیجیے مغربی جمہوری نظام میں چونکہ حاکمیت عوام کے لیے ہے، اس لیے جو لوگ ان کے نمائندے منتخب ہوتے ہیں اُنہیں قانون سازی کا مطلق حق حاصل ہوتا ہے، اب یہ بات اسلامی معاشرے میں سرے سے موجود ہی نہیں ہے کیونکہ اسلام میں مسلمانوں کے لیے مطلق قانون سازی کا کوئی تصور ہے ہی نہیں۔ یہاں قانون دینے والے خود سبحانہٗ تعالیٰ ہیں، ہاں ہمارے لیے اجتہاد کے دروازے کھلے ہیں۔ اب پچھلی صدیوں کے عظیم فقہی سرمایے پر ذرا ایک نظر ڈالیے اور بتایئے کہ کیا اس عرصے میں کوئی ایک بھی ایسا عالم، فقیہہ یا اصولی گزرا ہے جس نے یہ کہا ہو کہ اجتہاد کے لیے قرآن و سنت اور عربی زبان میں رسوخ شرط نہیں ہے؟ اس کے برعکس ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ امام غزالیؒ نے فرمایا: "ایک عام آدمی اجتہاد نہیں کر سکتا کیونکہ اہلیت نہ رکھنے کی وجہ سے وہ اس کام کے لیے اسی طرح نااہل ہے جس طرح نابالغ بچہ اور قاصر العقل آدمی"[۲] اور امام شافعیؒ نے فرمایا: اجتہاد

---

[۱] اس غیر شاعرانہ تصرف کے لیے روحِ اقبالؒ سے معذرت کے ساتھ۔
[۲] المستصفیٰ للغزالی جلد ۱ ص ۱۸۲ طبع دار الصادر۔

کی اہلیت نہ رکھنے والا اگر اجتہاد کرے تو اُس کی حیثیت اُس اندھے کی سی ہے جو خود بھی رستہ نہیں دیکھ سکتا (دوسرے کو کیا دکھائے گا؟) اس کے باوجود اگر وہ اجتہاد کرے تو گناہ گار ہوگا، حکومت کو چاہیے کہ زبردستی اُسے اِس کام سے روک دے[1] اور عربی زبان کے متعلق تو امام شاطبیؒ نے یہاں تک کہا ہے کہ "اجتہاد کرنے والے کو "مجتہد فی اللغۃ" ہونا چاہیے۔ اگرچہ یہ اجتہاد کے وسائل میں سے ہے[2]۔

اسمبلی اور بورڈ تو کیا اس قسم کی صفات ہماری قومی اسمبلی یا مجلسِ شوریٰ کے ممبران میں ہوتی ہیں؟ (جن کا ذکر فقہاء اور اصولیوں نے متفقہ طور پر کیا ہے) یا کیا یہ شرطان کے لیے رکھ کر قومی اسمبلی کے لیے الیکشن کروائے جا سکتے ہیں؟ ظاہر ہے یہ ناممکن ہے اور نہ اس پر کوئی تیار ہوگا۔ اب دوسری طرف دیکھیے کہ اگر علماء کی کوئی کونسل یا بورڈ بنایا جائے (کیوں کہ علماء ہی میں یہ شروط ممکنہ حد تک موجود ہو سکتی ہیں) تو اسے "مشاورتی" کا درجہ دیا جائے گا اور بات پھر انہی حکمرانوں اور سول سروس کے بزرجمہروں پر پہنچ کر رُک جائے گی کہ وہ مناسب سمجھیں تو اس کونسل یا بورڈ کی سفارشات کو مانیں اور چاہیں تو نہ مانیں۔ (جیسا کہ نظریاتی کونسل کی سفارشات کا حشر ہمارے سامنے ہے)۔

موجودہ زمانے میں اس اعتماد اور پہچان کی ایک ہی صورت قابلِ اعتماد رہ گئی ہے اور وہ انتخاب کی ہے، لہٰذا ہمیں کوئی ایسا راستہ سوچنا ہوگا کہ الیکشن کی قباحتوں سے بچ کر اس طرح کے لوگ مجلسِ شوریٰ یا اسمبلیوں میں پہنچ سکیں تاکہ وہ اجتہاد کر سکیں اور یہ اجتہاد اُمت کے لیے قابلِ قبول بھی ہو۔ ورنہ اگر دین سے ناواقف لوگ اجتہاد کرتے بھی رہیں اور قانون بناتے بھی رہیں تو اُن کی یقیناً کوئی پذیرائی نہ ہوگی۔ وہ غیر اسلامی قانون بناتے رہیں گے اور لوگ اُن کی مخالفت کرتے رہیں گے اور اس طرح ہماری صلاحیتیں باہمی انتشار کا شکار ہوتی رہیں گی اور ہم عنداللہ ماخوذ بھی ہوں گے۔

مسئلے کا حل یہاں اس نکتے کی وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ

---

[1] الرسالۃ للشافعی صفحہ ۵۰۹ طبع دار التراث بالقاہرہ۔

[2] الموافقات للشاطبی جلد ۴ ص ۱۰۸ طبع المکتبۃ التجاریہ۔

شوریٰ یا کمیٹی کے سارے ممبران ہی یہ "متخصص فقہا" ہونے والی سنت موجود ہو بلکہ خلفائے راشدین کے تعامل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی شوریٰ میں دو طرح کے لوگ تھے۔ ایک بڑی تعداد ان لوگوں کی تھی جو قبیلوں کے سربراہ اور علاقوں کے معزز ین تھے اور اس کے ساتھ ہی کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو قرآن و سنت اور فقہ کا گہرا اور خصوصی علم رکھتے تھے۔ عمومی مسائل میں ساری شوریٰ سے رائے لی جاتی تھی لیکن پیچیدہ دینی اور فقہی مسائل میں صرف ان متخصص حضرات کو رائے اور بحث کے لیے بلایا جاتا تھا[1] اسی پر قیاس کرتے ہوئے آج یہ کہا جاسکتا ہے کہ شوریٰ میں اکثریت ان لوگوں کی ہوسکتی ہے جو عوام کے معتمد ہوں، ان میں بارسوخ ہوں، اسلامی احکام کو جاننے والے اور اُن پر عمل کرنے والے ہوں اور زندگی کے مختلف شعبوں کے مسائل سے ماہرانہ واقفیت رکھتے ہوں، لیکن ان ممبران میں بہرحال کچھ تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہونی چاہیے جو قرآن و سنت نیز فقہ اور عربی زبان میں خصوصی مہارت رکھتے ہوں، فقہی اور قانونی معاملات میں ان کی رائے کو باقی لوگوں کی آراء کے مقابلے میں خاص وزن حاصل ہونا چاہیے۔

ایک آئینی و دستوری نظام رہا یہ سوال کہ اس سیدھی سادھی بات کو قانونی اور دستوری شکل کیا دی جائے؟ تو اس کی کئی صورتیں ممکن ہیں۔ سب سے بہتر صورت یہ ہے کہ الیکشن میں سیاسی جماعتیں حصہ

---

[1] معاصرین میں سے جنہوں نے اس رائے کو اختیار کیا ہے ان میں شیخ ذکریا البری (مجلہ، عالم الفکر، الکویت، شمارہ جنوری - مارچ ۱۹۷۱ء صفحہ ۱۳۱) اور ڈاکٹر محمد یعقوب الملیجی (کتاب مبدأ الشوریٰ فی الاسلام، صفحہ ۲۳۴ طبع اسکندریہ) قابلِ ذکر ہیں۔

یہاں یہ بھی ملحوظ رہے کہ اگرچہ سیاسہ شرعیہ پر لکھنے والے فقہاء نے اہلِ الشوریٰ، اہل الحل والعقد اور اہل الاختیار کی اصطلاحیں بطور مترادف کے استعمال کی ہیں لیکن بعض فقہاء نے ان میں "علما" اور "اہل الاجتہاد" کو شامل کیا ہے مثال کے طور پر ملاحظہ ہو:

— عبدالقاہر بغدادی، اصول الدین، صفحہ ۲۷۹ طبع بیروت ۱۴۰۰ھ

— قاضی ابویعلیٰ، الاحکام السلطانیہ، صفحہ ۱۹ طبع مصر ۱۳۰۶ھ

— امام نووی، منہاج الطالبین وعمدۃ المفتیین، صفحہ ۱۲۰ طبع مصر ۱۳۱۰ھ

لے رہی ہوں اور انتخابات متناسب نمائندگی کی بنیاد پر ہوں۔ سیاسی جماعتوں کو پہلے سے باخبر کر دیا جائے کہ انہیں اپنی فہرست میں علماء اور سکالرز کو رکھنا چاہیے۔۵ جو کامیابی کی صورت میں شوریٰ یا اسمبلی کے اندر ان کی نمائندگی کر سکیں۔ مجلس شوریٰ میں سیاسی جماعتوں کی حاصل کردہ نشستوں کے تناسب سے ہر جماعت کو ایک ایسی کمیٹی میں نمائندگی دی جائے جسے "اجتہاد کمیٹی" کہا جائے۔ یہ ایک خود مختار کمیٹی ہو جو اپنا چیئرمین خود چنے اور اپنا طریق کار خود وضع کرے۔ انتخابی قواعد میں ایک قانون کا اضافہ کیا جائے جس میں اس کمیٹی کے ممبران کی صفات و شروط بیان کر دی جائیں، (اور یہ شروط وہی ہوں جو سارے علماء، فقہا اور اصولیوں کے نزدیک متفق ہیں اور جو مجتہدین کی صفات کے طور پر فقہ اور اصولِ فقہ کی ساری کتابوں میں ملتے ہیں) اور کمیٹی کو یہ حق ہو کہ اگر وہ دو تہائی اکثریت سے یہ سمجھے کہ اس کے کسی ممبر میں اس طرح کی مطلوبہ صفات نہیں پائی جاتیں، تو وہ اس کی ممبرشپ ختم کر دیں اور متعلقہ سیاسی جماعت ان کی جگہ اسمبلی میں منتخب شدہ کسی دوسرے آدمی کا نام دے۔ سارے مسودہ ہائے قانون، مجلس شوریٰ میں ابتدائی اور عمومی بحث کے بعد اس کمیٹی کو بھجوا دیے جائیں، اس کمیٹی کو یہ اختیار ہو کہ وہ ہر قسم کے ماہرین کی خدمات سے استفادہ کر سکے۔ اس کمیٹی کا فیصلہ حتمی ہوگا۔ یہ گنجائش بھی رکھی جا سکتی ہے کہ مجلس شوریٰ کے باقی ممبران اور صدرِ مملکت اس کمیٹی کے پاس کردہ بل کو غور کے لیے مع مطلوبہ ترمیمات کے کمیٹی کے پاس واپس بھجوا سکیں، لیکن انہیں یہ اختیار نہیں ہونا چاہیے کہ وہ اس فیصلے کو رد کر سکیں۔ پرانے غیر اسلامی قوانین پر نظر ثانی کا کام بھی یہی کمیٹی کر سکتی ہے۔ اس کمیٹی کے پاس کردہ کسی بھی قانون کو عدالتِ عظمیٰ میں اس بنیاد پر چیلنج کرنے کی راہ بھی رکھی جا سکتی ہے کہ وہ قرآن و سنت کے خلاف ہے لیکن اس کے ساتھ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ عدالت کے جج صاحبان بھی قانونِ شریعت کے ماہرین پر مشتمل ہوں اور ان صفات کے حامل ہوں جو اس اجتہاد کمیٹی کے ممبران کے لیے قانون نے مقرر کی ہوں۔ اس تعریف کے مطابق چند ججوں پر مشتمل ایک جداگانہ بنچ بھی اس خاص ذمہ داری کو ادا کر سکتا ہے۔۵

۵ کوئی خاص تناسب بھی مقرر کیا جا سکتا ہے۔ (ن ۔ ص)

۵ شریعت کورٹس (اور قاضی عدالتوں) کا جو تصور پیدا ہوا ہے اور جس کے تحت (باقی صفحہ آئندہ)

ہماری رائے میں صرف اس طرح کا ایک ادارہ ہی ہماری موجودہ قانونی مشکلات کا حل ثابت ہو سکتا ہے جو منتخب اور با اختیار بھی ہو اور اہل لوگوں پر مشتمل بھی ہو۔ غیر جماعتی الیکشن کی صورت میں یہ طریقہ اختیار کیا جاسکتا ہے کہ جو علماء اور سکالرز بھی منتخب ہو کر اسمبلی میں پہنچیں، ان پر مشتمل یہ کمیٹی بنادی جائے۔[1] باقی تفصیلات ممکنہ حد تک وہی ہوں جن کا ہم نے ابھی ذکر کیا ہے۔

تلخیصاً عرض ہے کہ ماضی کی فقہی صورت حال کو نظیر کے طور پر پیش نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ وہ ایک مخصوص حالات کی پیداوار تھی۔ اگر عوام کے معتمد علیہ علماء و فقہاء پر مشتمل کوئی مجلس شوریٰ خلافتی نظام میں موجود ہوتی تو یقیناً علماء کو انفرادی یا اجتماعی (لیکن غیر سرکاری[2]) کوششیں تدوین فقہ کے لیے نہ کرنی پڑتیں۔ اب اگر ماضی کا سیاسی ڈھانچہ ٹوٹ گیا ہے تو آخر کیوں نہ سوچا جائے کہ اُمّت کے معتمد علیہ علماء پر مشتمل ایک ایسا ادارہ قائم کیا جائے۔ جو اُمّت کے لیے شورائی اجتہاد کا پلیٹ فارم ثابت ہو (جو شوریٰ ہو یا شوریٰ کا ایک جزء ہو) اور یہ بات صرف علمی اہمیت ہی کی حامل نہیں بلکہ اگر ارباب حل وعقد چاہیں تو اس طرح کی کسی سکیم پر وہ غور کرسکتے ہیں تاکہ ایک ایسا اجتہادی ادارہ وجود میں آسکے جو شرعی تقاضوں کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ عصری تقاضوں کو بھی پورا کرسکے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) عدلیہ میں جزوی طور پر تجربہ بھی ہو رہا ہے (خواہ وہ معیار سے کتنا کم ہو) اس کی روشنی میں بآسانی اجتہاد کمیٹی کے فیصلوں کی عدالتی جانچ کی جاسکتی ہے اور اس کے لیے راہیں نکالی جاسکتی ہیں۔ (ن۔ ص)

(حاشیہ صفحہ ہذا)

[1] اس کے لیے کوئی میکنزم۔ اور معیار تجویز کرنے کی ضرورت ہے کہ کسی کے صلاحیتِ اجتہاد کا معیار کیا ہو اور کون اس بارے میں فیصلہ کرے۔ (ن۔ ص)

[2] اس کی بہترین مثال وہ پرائیویٹ مجلسِ اجتہاد ہے جس میں چند علماء نے امام ابوحنیفہ رح کی سربراہی میں سالہا سال کام کیا۔

بحث ونظر

مسجد کونسل رابطۂ عالمِ اسلامی کی قرارداد

(اذان سے قبل صلاۃ وسلام کے متعلق)

از مولانا عبد المالک صاحب شیخ الحدیث مرکز علومِ اسلامیہ منصورہ

یہ ایک المیہ ہے کہ ہمارے بعض علماء اس انتظار میں رہتے ہیں کہ انہیں کوئی ایسی چیز ہاتھ آئے جس کو وہ دوسروں کے خلاف نفرت پیدا کرنے اور ان کے خلاف محاذ آرا ہونے کے لیے استعمال کرسکیں اور اسی جذبے کی بنا پر بعض اوقات ایک صحیح اور متفق علیہ چیز کو غلط اور مختلف فیہ بنانے میں کوشش میں لگ جاتے ہیں۔ حالانکہ آج تک کے تجربے نے یہ بات ثابت کردی ہے کہ اس سے کسی بھی فریق کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا لیکن ہمارے قابلِ قدر علمائے کرام پھر اسی تجربے کو دہرانا شروع کردیتے ہیں اور وہی چیز جو انہیں قریب لانے میں بھی ممد و معاون ہوسکتی ہے اس کو افتراق وانتشار کا ذریعہ بنا دیا جاتا ہے۔

حال ہی میں "رابطۂ عالمِ اسلامی" کی طرف سے اذان سے قبل صلوٰۃ وسلام کے بارے میں جو قرارداد آئی ہے اس کے ساتھ بھی یہی سلوک روا رکھا گیا ہے۔ حالانکہ اس میں جو کچھ کہا گیا ہے اس سے کسی مسلک پر زد نہیں پڑتی۔ جہاں تک میرا مطالعہ ہے میری دیانت دارانہ رائے ہے کہ علمائے اہلِ سنت بریلوی کا بھی اصل مسلک یہ ہے کہ اذان اور اقامت کے درمیان "تثویب" میں کوئی حرج نہیں اور تثویب کا معنی بالاتفاق "الاعلام بعد الاعلام" سے کیا گیا ہے جس کا مطلب "اطلاع کے بعد دوبارہ اطلاع" کرنے کے ہیں۔ یعنی ایک مرتبہ لوگوں کو نماز باجماعت کے لیے اذان کے ذریعے اطلاع دینا اور دوسری مرتبہ اقامت سے پہلے کسی لفظ سے نماز باجماعت کی طرف متوجہ کرنا۔

متاخرین فقہاء احناف نے اسے مستحسن قرار دیا ہے۔ بریلوی علماء نے اس کے لیے "صلوٰۃ وسلام" کے کلمات کو مقرر کیا ہے۔ ان کا اصل مسلک تو میرے علم کی حد تک یہی ہے۔ اس مسلک کا تقاضا یہ ہے کہ اذان سے قبل صلوٰۃ وسلام نہ پڑھا جائے، لیکن عملاً اذان شروع کرنے سے پہلے صلوٰۃ وسلام پڑھا جاتا ہے۔ جس کا رواج کسی دور میں نہ تھا اور نہ ہی بریلوی مسلک کے اکابرین نے اسے آدابِ اذان میں شمار کیا ہے۔ پھر بریلوی مسلک کے نام پر اس چیز کو کیوں رواج دیا جا رہا ہے؟ اس پر خود بریلوی مسلک کے اہلِ علم کو ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کرنا چاہیے اور اگر رابطہ عالم اسلامی کی قرارداد سے اس طرف توجہ مبذول کروائی گئی ہے تو اس پر ناراض ہونے کے بجائے شکرگزار ہونا چاہیے۔ ہاں! اگر رابطہ عالم اسلامی کی طرف سے صلوٰۃ وسلام کے ان کلمات کو نہ پڑھنے کی سفارش ہوتی جن کلمات صلوٰۃ وسلام کو بریلوی مسلک میں اہمیت حاصل ہے تو انھیں اس سے اختلاف کرنے کا حق تھا۔ اگرچہ ایسی صورت میں بھی اس عالمی تنظیم جسے حرمین شریفین کے ساتھ نسبت اور تعلق کا شرف حاصل ہے، سے احترام کے ساتھ اختلاف ہونا چاہیے کہ یہ ہمارے دعویٰ محبتِ رسولؐ کا تقاضا ہے لیکن مسئلہ زیرِ بحث میں تو ایسی بات کہی گئی ہے جو متفق علیہ ہے۔

مولانا امجد علی رحمۃ اللہ علیہ اپنی مشہور و معروف کتاب بہارِ شریعت میں فرماتے ہیں:

"مسئلہ: متاخرین نے تثویب مستحسن رکھی ہے یعنی اذان کے بعد نماز کے لیے دوبارہ اعلان کرنا اور اس کے لیے شرع نے کوئی خاص الفاظ مقرر نہیں کیے بلکہ جو وہاں کا عرف ہو مثلاً الصلوٰۃ الصلوٰۃ (نماز نماز) یا قامت قامت (کھڑی ہو گئی کھڑی ہو گئی) یا الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ" (حصہ سوم ص ۳۷)

اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں — سوال و جواب درج ذیل ہیں:

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید اقامت سے قبل درود شریف با آواز بلند پڑھتا ہے اور اس کے ساتھ اقامت یعنی تکبیر شروع کر دیتا ہے کہ جس سے عوام کو معلوم ہوتا ہے کہ درود شریف اقامت کا جز ہے اور عمرو درود شریف نہیں پڑھتا صرف اقامت کہتا ہے تو زید کو یہ فعل اس کا ناپسند

آتا ہے اور اصرار سے اس کو پڑھنے کو کہتا ہے۔ اس صورت میں درود شریف جہر سے پڑھنا اور زید کا اصرار کرنا کیسا ہے؟

جواب:۔ "درود شریف قبل اقامت پڑھنے میں کوئی حرج نہیں مگر اقامت سے قبل چاہیے یا درود شریف کی آواز اقامت سے ایسی جدا ہو کہ امتیاز رہے اور عوام کو درود شریف جزوِ اقامت معلوم نہ ہو۔ رہا زید کا عمرو پر اصرار سو وہ اصلاً کوئی وجہ شرعی نہیں رکھتا۔ یہ زید کی زیادتی ہے۔" (فتاویٰ رضویہ مسئلہ ۳۴۸ جلد ۲ ص ۳۵۱)

یعنی اعلیٰ حضرت نے فرمایا کہ درود شریف اقامت سے قبل فاصلہ رکھ کر پڑھے یا اگر متصلاً پہلے پڑھنا ہو تو اس کے پڑھنے کا انداز ایسا ہو کہ لوگ محسوس کریں کہ اقامت ابھی شروع نہیں ہوئی اقامت اس کے بعد ہوگی۔ گویا آپ نے بھی اس اصول کو بیان کیا کہ درود شریف کو اس طرح نہ پڑھا جائے کہ یہ اقامت کا حصہ معلوم ہو اور پڑھنے کا حکم یہ نہیں بیان کیا کہ یہ اقامت کے آداب میں سے ہے اور مستحب ہے۔ بلکہ حرج کی نفی فرمائی کہ پڑھنے میں کوئی حرج نہیں اور پڑھنے پر اصرار کرنے والے کی بات کو بے اصل قرار دیا۔ ایک اور سوال کے جواب میں تثویب میں چند اضافوں کو بدعت قرار دیتے ہیں۔ جن میں بعض درج ذیل ہیں:

۱۔ نہ پکارنے کو گناہ جاننا۔
۲۔ نہ پکارنے سے نماز جمعہ میں قصور سمجھنا۔
۳۔ نہ پکارنے والے کو تقلید سیدنا امام اعظم رضی اللہ عنہ سے باہر خیال کرنا۔
۴۔ معاذ اللہ اسے بے ایمان گمان کرنا۔

یہ اعتقادِ باطل و ضلال ہیں۔ ان کے معتقدین پر توبہ فرض قطعی ہے اور ان رسوم و خیالاتِ باطلہ کا ہدم اور اعدام لازم ہے۔" قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من احدث فی امرنا ھذا ما لیس منہ فھو رد۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم" (مسئلہ نمبر ۳۵۰ جلد ۲ ص ۳۵۲)

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس وقت اس مسئلے کو جس انداز سے اٹھایا گیا ہے۔ کیا وہ اعلیٰ حضرتؒ

کے مذکورہ بالا ارشاد سے مطابقت رکھتا ہے؟ اعلیٰ حضرت "اصرار کرنے والے" کی بات کو بے اصل "نہ پکارنے کو گناہ" قرار دینے والے کے نظریہ کو بدعت قرار دے رہے ہیں۔ ایسی صورت میں رابطہ عالم اسلامی کی قرارداد پر اعتراض کو کیسے اعلیٰ حضرت کے مسلک کی نمائندگی قرار دیا جا سکتا ہے جب کہ اس سے قبل حضرت مولانا مفتی محمد حسین نعیمی ایک استفسار کا جواب دیتے ہوئے فرما چکے ہیں کہ:

"اذان کے کلمات مقرر ہیں، اس میں کمی بیشی کرنا یا ان کے آگے پیچھے درود شریف یا قرآن کریم کی آیات بلا فصل ملانا بدعت اور عبادتِ الٰہی میں خلل ڈالنے کے مترادف ہے، اذان کے ساتھ اوّل درود شریف کو لازم قرار دینا اہلِ سنّت کا شعار بنانا بھی بدعت اور عبادتِ معہودہ میں تحریف کرنے کی کوشش ہے۔"

(بحوالہ تعلیمات شاہ احمد رضا خان بریلوی ص ۸۵)

کیا اعلیٰ حضرت اور مذکورہ بالا دیگر علماء کرام کے علم میں یہ بات نہیں تھی کہ اذان سے قبل درود شریف پڑھنے کی ممانعت نہیں انہوں نے اس اصول کہ "جس چیز کی ممانعت نہ ہو اس کو کر لینے کی اجازت ہے" کی بنیاد پر اذان سے قبل درود و سلام کی بطور تثویب اجازت نہیں دی تب آج اس اصول کی بنیاد پر اذان سے قبل درود و سلام کو کیسے رواج دیا جا سکتا ہے۔

ایک اور پہلو سے میں محترم علماء بریلوی سے گذارش کروں گا کہ وہ بدلے ہوئے حالات جبکہ "اذانیں" سپیکروں پر دی جا رہی ہیں، نمازوں کے اوقات گھڑیوں کے حساب سے مقرر ہیں اور لوگوں کو گھڑیوں کی سہولت حاصل ہے اور اکثریت اذان کی آواز پر بھی ٹس سے مس نہیں ہوتی۔ اس بات پر بھی غور فرمالیں کہ کیا متاخرین فقہاء احناف نے جن حالات میں "تثویب" کو مستحسن قرار دیا تھا وہ حالات آج موجود ہیں؟ اگر وہ دیانت داری سے سمجھتے ہوں کہ حالات اسی طرح کے ہیں اور تثویب کی ضرورت ہے تو وہ تثویب کو تثویب کی حیثیت سے رواج دیں

مزید برآں میں ان سے یہ بھی عرض کروں گا کہ صلوٰۃ و سلام کو بطور تثویب مقرر کرنا یہ خالص اُن کی ذاتی رائے ہے اس پر بھی اس نقطۂ نظر سے غور کر لیں کہ متاخرین نے جس چیز کو تثویب

کے طور پر مقرر کیا تھا۔ اس میں یہ شرط لگائی گئی تھی کہ وہ عرفاً اعلام کے لیے ہو لیکن صلاۃ وسلام میں اعلام کا کوئی پہلو نہیں ہے اور نہ ہی عرفاً اس کو نماز کی اطلاع سمجھا جاتا ہے، بلکہ اسے درود و سلام سمجھا جاتا ہے اور اسے صرف تثویب کے طور پر نہیں پڑھا جاتا کہ تخصیص استعمال کی وجہ سے تثویب قرار پائے۔

تیسری چیز یہ بھی پیش نظر رکھیں کہ اس وقت اسے عملاً اذان کے آداب کے طور پر اذان سے متصل پڑھا جاتا ہے۔ یہ چیز لازماً آگے چل کر یہ نتیجہ پیدا کرے گی کہ لوگ اذانوں کو مختلف سمجھنے لگیں گے اور کہیں گے کہ مسلمانوں کے مختلف فرقوں کی اذانیں مختلف ہیں۔

چوتھی چیز یہ کہ بعض صحابہ کرامؓ سے تثویب کو بدعت قرار دینے کی تصریح ثابت ہے۔ اور اسی واسطے متاخرین کے استحسان کے باوجود تثویب بمعنی "مسجد سے دوبارہ اعلان" کو کسی بھی دور میں عمومی رواج نہیں ملا۔ اگر کبھی کسی دور اور کسی علاقے میں "تثویب" کا سلسلہ شروع ہوا تو ختم بھی ہو گیا اور صرف ایک تاریخی اور نادر واقع کی حیثیت سے تاریخ کا حصہ بن گیا۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے مزاج سے اس کی کتنی مطابقت ہے۔

ان وجوہ سے میں یہ سمجھتا ہوں کہ رابطہ عالم اسلامی کی مسجد کونسل کی قرارداد قابل قدر ہے اور اس میں تمام مسالک کی راہنمائی کا سامان ہے نیز میں اہل علم سے گذارش کروں گا کہ وہ اختلافات کو بڑھانے کی بجائے اتفاقی امور پر نظر رکھتے ہوئے ایک دوسرے کے قریب ہونے کی کوشش کریں کہ اسی میں امتِ مسلمہ اور اس کے ہر طبقہ کی بھلائی ہے۔

مطبوعات

WAY TO THE QURAN مؤلف: خرم مراد۔ شائع کردہ: اسلامک فاؤنڈیشن، ۲۲۳ لندن روڈ، لائسسٹر LE2 1ZE برطانیہ۔ صفحات: ۱۴۴۔ سرورق دبیز آرٹ کارڈ۔ قیمت: نامعلوم

انگریزی میں لکھی ہوئی اس کتاب کا پہلے تو حُسنِ ظاہر ساری توجہ کھینچ لیتا ہے۔ جدید کتاب سازی کا یہ فن مقامِ بلند پر پہنچ گیا ہے کہ سرورق کی ڈیزائننگ، رنگوں کی ترتیب اور طباعت کے انتہائی سادہ انداز کے باوجود کتاب پکار کے کہتی ہے کہ مجھے پڑھو۔ خوب صورتی طباعت ہی میں نہیں بلکہ خود معانی و مطالب کے حُسن کے علاوہ اس میں زبان اور طرزِ بیان کا حُسن بھی زوروں پر ہے۔

کتاب ملتے ہی میں نے اسے پڑھ ڈالا۔ ملخصاً کہا جا سکتا ہے کہ اس میں بڑی دلسوزی اور شعور انگیزی کے ساتھ قرآن کا مطالعہ کرنے اور اس سے صحیح اور مکمل استفادہ کرنے کی صورتیں بتائی گئی ہیں۔ اخلاصِ نیت سے لے کر ترتیل تک، اور ترجمے سے لے کر تفسیر تک بڑی اچھی رہنمائی دی گئی ہے۔ انفرادی مطالعہ اور اجتماعی مطالعہ، اسٹڈی سرکل اور درس وغیرہ کی مختلف سطحوں پر قرآن کا حق ادا کرنے اور اس کے پیغام کو بہترین پیرایہ ہائے ابلاغ سے دوسروں تک پہنچانے کے لیے جو مشورے دیے گئے اُن کی بنیاد خود قرآن و حدیث کے مطالعہ پر ہے اور دوسری طرف جدید نفسیات اور ماحول کے متعلق حاصل شدہ تجربات سے بھی مدد لی گئی ہے۔

کتاب یہ بھی بتاتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مختلف نمازوں میں کون کون سی سورتیں یا آیات پڑھتے تھے۔ نیز آپ نے قرآن کے خاص خاص حصّوں کے متعلق کیا فضائل بیان کیے ہیں۔

آخر میں درسِ قرآن (ماہانہ اور ہفتہ وار) کے لیے ایک مختصر نصاب اور دوسرا تفصیلی نصاب

تجویز کیا گیا ہے۔

قرآن کی خدمت کرنے والے اور قرآن کا پیغام خود سمجھ کر دوسروں کو سمجھانے والے اور قرآن کا عملاً غلبہ چاہنے والے افراد اور گروہوں کے لیے اس مختصر کتاب کا مطالعہ بہت مفید رہے گا۔

انکم ٹیکس احکام الٰہی کی روشنی میں | تالیف: نذرالحق لون۔ مینجنگ ڈائریکٹر آئی ڈی لون اینڈ سنز، راولپنڈی۔ شائع کردہ: فرم مذکور، پوسٹ بکس ۳۴۔ آدم جی روڈ، راولپنڈی۔ قیمت درج نہیں۔

مؤلف بہت سے دینی، تعلیمی، فلاحی اور معاشی اداروں میں (جن میں سرکاری بھی ہیں اور قومی بھی) معزز مناصب رکھتے ہیں اور ان کی وجہ سے انہیں یہ سہولت بھی ملی کہ وہ اپنے موضوع سے متعلق جملہ احوال کی واقفیت رکھیں۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ اس کتاب کی گواہی کے مطابق لون صاحب کے پاس مالیاتی اور قانونی معلومات و تجربات ہی نہیں، جذبۂ ایمانی اور اسلامی نقطۂ نظر بھی ہے۔ اس نقطۂ نظر کے ساتھ انہوں نے انکم ٹیکس کے قوانین پر ایک ایک کرکے بحث کی ہے اور مقابل میں اسلامی اصول و احکام رکھ کر دکھایا ہے کہ کتنا بڑا تضاد ہمارے ملک میں کارفرما ہے۔

میں نے اسے ایک سرسری تالیف سمجھ کر پڑھنا شروع کیا، مگر سفرِ مطالعہ طے کرنے کے ساتھ ساتھ میرے دل میں اس کاوش کی قدر و قیمت بڑھتی گئی۔

دراصل یہ ایک مقالہ ہے جو کراچی چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری کی دعوت پر ان کے ایک اجلاس (مئی ۱۹۸۵ء) میں پڑھا گیا۔

ہمدرد نونہال (خاص نمبر) | مدیر اعلیٰ: مسعود احمد برکاتی، صدر حکیم محمد سعید صاحب۔ مقام اشاعت: ہمدرد نونہال، ہمدرد ڈاک خانہ، ناظم آباد۔ کراچی ۱۸۔ قیمت خاص نمبر ۸/- روپیہ۔

بچوں کے لیے یہ کہانیوں کا بہت اچھا مجموعہ ہے جو ۲۸۸ صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں۔ ان کہانیوں

کے لکھنے والوں میں کئی نامور اور مشاق اہلِ قلم ہیں۔ یہ کہانیاں پرانے طرز کی خواب ناک کہانیوں سے مختلف ہیں۔ زندگی کی حقیقتیں، مختصر پلاٹ، چلتے پھرتے کردار، بچوں کے لیے سلیس زبان اور سادہ اندازِ بیان اور ذہنوں پر نقوش چھوڑنے والے نتائج۔
یہ ہے مختصر تعریف ان کہانیوں کی۔ کچھ معلوماتی مواد بھی شامل ہے۔ لطیفے بھی ہیں، رنگین تصاویر بھی اور عربی زبان کے بہت آسان سے دو سبق بھی ہیں۔
۱۶ صفحے کا ایک دلچسپ پمفلٹ [illegible] نمبر کے ساتھ ملتا ہے جس میں بڑی اہم معلومات (خصوصاً سائنسی) سطر بہ سطر دی گئی ہیں۔

المعارف بہ ادارت: سراج منیر و محمد اسحٰق بھٹی صاحبان۔ دفتر: ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور۔ قیمت فی شمارہ ۲۵/- روپے۔ سالانہ ۴۰/- روپے۔ (قیمتوں کا تناسب سمجھ میں نہیں آیا۔)

المعارف کی اشاعت نو کے خاص کا سلسلہ حال ہی میں شروع ہوا ہے اور اس کا تیسرا شمارہ ہم تک پہنچا ہے۔ یہ مضمون بہ مضمون تفصیلی گفتگو تو ممکن نہیں، اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ یہ علمی رسالہ اس قابل ہے کہ اس کا خیر مقدم کیا جائے۔ اس میں جو بھی مضامین و مقالات شائع ہوئے ہیں وہ بہت تحقیقی اور بصیرت مندانہ ہیں۔ مجموعی طور پر المعارف کے مضامین و مقالات یا تو اسلامی موضوعات سے متعلق ہیں یا اُن پر بھی اسلامی فکر و ثقافت کا عکس یا سایہ ضرور موجود ہے۔ اِس وقت شمارہ نمبر ۳ میرے سامنے ہے اور اس کی فہرست میں درج تقریباً تمام مضامین کا تعلق اسلامی فکر، اسلامی ادب، اسلامی تاریخ اور اسلامی شخصیتوں سے ہے۔ لکھنے والے سبھی ایسے ہیں کہ اپنا ایک مقام رکھتے ہیں۔ خوشی کا مقام ہے کہ ادارے کا اسلامی تصور اس رسالے میں متجددانہ نہیں ہے۔

انفاق فی سبیل اللہ | مؤلف: منیر احمد خلیلی - ناشر: حسن البنا اکیڈمی، راولپنڈی -
صفحات: ۲۲۴ قیمت: -/۳۰ روپے -

اسلامی نظامِ زندگی کا ایک اہم شعبہ انفاق فی سبیل اللہ ہے - سورۃ بقرہ کے آغاز ہی میں قرآن سے ہدایت پانے والوں کی ایک لازمی صفت (یا شرط) یہ بتائی گئی ہے وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۔ انفاق فی سبیل اللہ میں زکوٰۃ تو اہم فریضہ کی حیثیت سے آتی ہے، مگر بوڑھے والدین اور اہل و عیال کی کفالت، رشتہ داروں اور پڑوسیوں کی اعانت، اور یتیموں، مسکینوں، بیواؤں، قیدیوں، بیماروں، بوڑھوں، مسافروں اور سائلوں اور مصیبت زدہ لوگوں کی خدمت کے علاوہ نذر، نیاز اور فطرانہ، مصارفِ سفرِ حج، قربانی، مالی کفارات، عفو طلبی اور مصیبت سے نجات کے لیے صدقات وغیرہ بے شمار مدات ہیں - پھر ان چیزوں سے بھی آگے تبلیغِ دین، تعلیمِ دین، سعی اقامتِ دین اور جہاد فی سبیل اللہ کے لیے کھلے دل سے مال خرچ کیے بغیر حق ادا نہیں ہو سکتا - باقی چیزوں پر تو جناب مؤلف نے ضروری باتیں لکھی ہیں، مگر اس آخری تفصیل طلب موضوع پر وضاحت و صراحت سے کچھ زور گفتگو نہیں ہو سکی -

یوں اس کتاب میں آیات و احادیث اور حضورؐ پاک کے عملی نمونے اور صحابہ کرامؓ کے واقعاتی نظائر کو پیش کر کے اپنے مباحث کو مؤثر بنایا ہے - انہوں نے خاص توجہ اس بات پر دلائی ہے کہ خدا کے ہاں کوئی انفاق ناپسندیدہ اور نامقبول کن وجوہ سے ہوتا ہے - اور یہ کتاب کا ضروری حصہ ہے - خلیلی صاحب نے واضح کیا ہے کہ مادہ پرستانہ ذہنیت وہ بلا ہے جو آدمی میں بخل اور کنجوسی کے ساتھ اپنی خواہشوں کے لیے تو اسراف تک پیدا کر دیتی ہے مگر آدمی کو انفاق فی سبیل اللہ سے روکتی ہے - ان کی یہ بحث بھی اہم ہے

تمام مسلمانوں، خصوصاً دینی کام کرنے والوں اور طلبہ کو اس کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے -

---

حجابِ نسواں | مؤلف: استاد مظہر ادیب صاحب - ناشر: مکتبۃ السفیر، قذافی مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور - صفحات: ۱۱۲ قیمت: -/۸ روپے

مظہر ادیب صاحب کی تحریروں سے میں کئی برس سے استفادہ کرتا رہا ہوں - وہ ایک صاف

سفر سے ذہن اور مغرب کے تہذیبی سامراج سے آزاد اسلامی فکر سے بہرہ مند ہیں۔ عورت اور پردے کے موضوع پر انہوں نے پہلے بھی لکھا ہے اور ان دنوں جو نئی بحثیں چھڑی ہوئی ہیں اُن کو سامنے رکھ کر تازہ مختصر کتاب حجابِ نسواں مرتب کی ہے۔ ان کا اندازِ تحریر مؤثر ہوتا ہے۔ اُمید ہے کہ اس کتاب کو مقبولیت حاصل ہوگی اور اسے نہ صرف اسلام سے گہری وابستگی رکھنے والی خواتین پڑھیں گی، بلکہ معاشرے کا فعال عنصر اسے جدید خواتین تک بھی پہنچا دے گا۔

UNITE THE NECKTIE مؤلف: استاذ مظہر ادیب۔ ناشر: مکتبۃ السفیر، اُردو بازار لاہور ۲ قیمت: ۴/- روپے

اس پمفلٹ میں مؤلف نے انگریزی اخبارات کے لیے لکھے ہوئے (اور شائع شدہ) خطوط کا ایک انتخاب جمع کیا ہے۔ زیادہ تر ان خطوط کا تعلق معاشرتی احوال سے ہے۔ یہ گویا چھوٹے چھوٹے دلچسپ نوٹ ہیں۔ کاش کہ طباعتی معیار ذرا بہتر ہوتا۔

انقلابِ ایران اور اس کی اسلامیت از مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی۔ ناشر: ملک سنز، کارخانہ بازار، فیصل آباد صفحات: ۸۰ قیمت: ۹/- روپے

فروری ۱۹۷۹ء کے انقلابِ ایران کا تیسرا سال نفاذ فروری ۱۹۸۲ء کہ مؤلف کو ایران کا بچشمِ خود مشاہدہ کرنے کا موقع ملا۔ اپنے سفرِ ایران کا حال موصوف نے افادۂ عام کے لیے قلم بند کیا۔ یہ طریقِ مطالعہ مناسب و متوازن ہے کہ سنبھلی صاحب نے انقلابِ ایران کے جو خوشگوار پہلو دیکھے وہ بھی دلی اعتراف کے ساتھ پیش کر دیئے اور جن چیزوں کو ناخوشگوار پایا ان کا تذکرہ بھی کر دیا۔ انقلابِ ایران سے جن بھی اصحاب کو موافقانہ یا مخالفانہ لحاظ سے دلچسپی ہو ان کو اس سفرنامے کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

پیامِ رابطہ | جریدہ من جانب رابطۃ الطلاب الروہنجیین المسلمین ۔ مقام اشاعت وقیمت نامعلوم۔
چار صفحے کے اس اخبار کو پڑھ کر اراکان اور برما کے مسلمانوں کے قیامت آفریں حالات معلوم کیے جا سکتے ہیں ۔ شرم آنی چاہیے دُنیا کی تمام مسلمان حکومتوں کو جو حکومت برما سے نہ موثر احتجاج کرتی ہیں، نہ اصلاحِ احوال کا پُر زور مطالبہ کرتی ہیں ، نہ سفارتی اور تجارتی تعلقات منقطع کرتی ہیں اور نہ کوئی حکومت برمی مسلمانوں کو نکال کر اپنے ہاں اس انداز سے جگہ دینے پر تیار ہے جیسے اسرائیل نے حبشہ سے یہودیوں کو نکال لیا ہے ۔

حضرت مسیح علیہ السلام مرزا قادیانی کی نظر میں | از مولانا لال حسین اختر مرحوم ۔ ناشر: مجلسِ تحفظِ ختمِ نبوت، حضوری باغ ، ملتان ۔
مسیح علیہ السلام کے متعلق جو توہین آمیز خرافات مرزا قادیانی نے لکھی ہیں ۔ یہ پمفلٹ ان کا آئینہ دار ہے۔

ذکری مذہب اور اسلام | مولوی عبدالمجید بن مولوی اسحٰق (مشکے ،خضدار) ۔ ناشر: مجلسِ تحفظِ ختمِ نبوت پاکستان ، شارع لیاقت ، کوئٹہ ، بلوچستان ۔ قیمت ۶/- روپیہ
ذکری مذہب اپنی جگہ بہت بڑا فتنہ ہے ، مگر قادیانیت کے طوفانِ عظیم نے مسلمانوں کو ادھر متوجہ ہونے کا موقع ہی نہیں دیا ۔ ذکری گروہ اپنے عقاید ، عبادات ، رسوم اور شعائر کے لحاظ سے مسلمانوں سے کوسوں دُور ہے ۔ اس پمفلٹ میں ضروری معلومات دی گئی ہیں ۔ بعض عدالتی فیصلے بھی درج ہیں ۔ چند اہم افراد کی آرا بھی ہیں ، آخر میں مآخذ بھی درج کیے گئے ہیں ۔

۱۔ مصنوعی حج
۲۔ ذکری عقاید آپ کی عدالت میں | از ایم ایس بلوچ ۔ ناشر: مجلسِ تحفظِ اسلام پاکستان ، شارع اقبال کوئٹہ ، بلوچستان ۔ یہ دونوں پمفلٹ بھی اوپر ہی کے مبحث سے متعلق ہیں ۔

نفسِ رسولؐ از جناب آیۃ اللہ العظمیٰ آقائے سید علی حیدر نقوی۔ ناشر: کتب خانہ شاہ نجف، اندرون موچی دروازہ، لاہور ۸۔

حضرت سیدنا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فضیلت کو یہاں تک پہنچایا گیا ہے کہ وہ قرآنِ ناطق ہیں۔ دلیل یہ ہے کہ بسم اللہ کا پہلا حرف "ب" ہے اور "ب" کا نقطہ حضرت علیؓ ہیں۔ اگر حضرت امیرؓ نہ ہوں تو "ب" نہیں بن سکتی، پھر بسم اللہ کیسے بنے گی اور قرآن کیسے تشکیل پائے گا۔ کوئی دوسرا کہہ سکتا ہے حضرت ابوبکر صدیقؓ "ا" ہیں اور "ا" کے بغیر نہ "الحمد" نہ "الم" نہ "اللہ"، نہ باقی قرآن۔ فرمایا ہے کہ حضورؐ کو اس وقت تک نبی نہیں بنایا گیا جب تک حضرت علیؓ ساتھ دینے کے قائل نہیں ہوگئے۔ یہی بات دوسرے سابقون الاولون کے لیے بھی کہی جا سکتی ہے۔ پھر فرمایا۔ اسلام رسولؐ خدا اور حضرت علیؓ دونوں کا محتاج تھا۔ دونوں بزرگ گاڑی کے دو پہیے تھے، مگر گاڑیاں تو چار چار پہیوں والی بھی ہوتی ہیں اور ریل گاڑی کے تو بیسیوں پہیے یک دم کام کرتے ہیں۔

درخواست ہے کہ اس طرح کی منطق کے بل پر نکتہ آرائیاں کرنے کا دور اب ختم ہو رہا ہے۔ کچھ غلبۂ دین اور خدمتِ انسانیت کی بات کیجیے۔
